لکھنؤ
تعمیر حیات
پندرہ روزہ

خلوص کی جنتری

حضرت عیسیٰؑ نے دو ہزار برس پہلے خلوص کے ساتھ جو انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی تھی، آج انھیں کی جنتری چل رہی ہے، آج انھیں کا نام لیا جارہا ہے۔ خدا کے پیغمبروں نے حضرت آدمؑ سے لے کر نوحؑ، ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک، انھوں نے بے غرض دنیا کی خدمت کی۔ انھوں نے دنیا کو محبت کا پیام دیا، انھوں نے دنیا کو دیا اور لیا کچھ نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ سیکڑوں ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی ان کا نام زندہ ہے، ان کا کام زندہ ہے۔ لوگوں کے دل میں انکی محبت ہے، خواہ ان کے پورے راستے پر نہ چلے لیکن عظمت کے ساتھ، عزت کے ساتھ ان کا نام لیتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا کام بالکل بے غرض تھا۔

تو ایک راستہ تو ہے بادشاہوں کا، سیاست دانوں کا، حکمرانوں کا، طاقت رکھنے والوں کا اور خود غرض لیڈروں کا۔

اور دوسرا راستہ محبت، پریم، معاف کر دینے کا راستہ، بے غرضی اور خلوص کا راستہ، آپ دیکھ رہے ہیں کہ سورج کی طرح وہ چمک رہے ہیں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے زمانہ کے انقلاب زمانہ کتنا بدل گیا، کتنا آگے بڑھ گیا، لیکن ابھی تک اسی طرح سے ان کا ستارۂ اقبال بلند ہے اور ان کی عزت، شہرت، مقبولیت کا سورج اسی طرح سے درخشاں ہے۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ برائی کا جواب برائی سے دیجئے، نفرت کا جواب نفرت سے دیجئے، اور ایک راستہ یہ ہے کہ نفرت کا جواب بھی آپ محبت سے دیجئے۔ پہلا راستہ سیاسی لوگوں کا اور مادہ پرستوں کا ہے۔ پہلا راستہ طاقت پر ایمان و عقیدہ رکھنے والوں کا ہے اور دوسرا راستہ خدا کے پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کا ہے۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

Regd No. LW/NP 56
Phone:- 2948 / 9747
TAMEER-E-HAYAT
Fortnightly
NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

سے تنگی شروع ہوگئی تھی اس لئے محراب کی سمت مزید توسیع کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ زیر تعمیر اضافہ ان شاء اللہ سہ منزلہ ہوگا اور مسجد کے مسقف حصہ کے بقدر توسیع ہو کر نماز کے لئے دوگنی گنجائش نکل آئے گی۔

ڈسپنسری

طلبہ و اساتذہ کی سہولت اور اسپتالوں کی بھیڑ بھاڑ اور بے توجہی کو دیکھتے ہوئے ایک ڈسپنسری قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کی تعمیر شروع ہوگئی ہے۔

پریس اور دفاتر کی عمارت

پریس اور مختلف دفاتر کے لئے علیحدہ ایک عمارت بھی عرصہ سے زیر تجویز رہی ہے تاکہ دارالعلوم کی عمارت صرف تعلیمی اغراض ہی میں استعمال ہو۔ سارے درجات اسی میں رہیں، جگہ کی تنگی کی وجہ سے جو انتشار کبھی کبھی ہو جاتا ہے وہ ختم ہو جائے، چنانچہ اس عمارت کا بھی نقشہ منظور ہوگیا ہے اور اس عمارت کی تعمیر بھی ہونا ہے۔

ان گذارشات کے بعد آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس اہم ضرورت اور دارالعلوم کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائیدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔ آپ میں سے جو لوگ ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی میں شریک تھے، ان کو یاد ہوگا کہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے غیر ملکی عرب مہمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"یہ سونے کی چڑیاں سب اڑ جائیں گی، ہم اور آپ یہاں رہیں گے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ اب آپ کو چھٹی مل گئی، ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں ہمارے سفیر آپ کے گھروں پر جائیں گے، آپ کے چار آنے آٹھ آنے ہم کو عزیز ہیں یہ جو کچھ دیں گے وہ اس دولت کا ہزارواں حصہ ہوگا جو خدا نے ان کو دیا ہے اور جو آپ دیں گے وہ آپ کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوگی۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک مالیات، بجٹ اور عظیم الشان عمارتوں سے زیادہ وہ مقصد عزیز ہے جس کے لئے دارالعلوم قائم کیا گیا ہے، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی موثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور علوم اسلامیہ کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت، مسلک کی اس قدر تشریح اور وضاحت کے بعد ہمیں اب مزید کچھ کہنے کی حاجت نہیں، ہم اللہ کا نام لے کر ان میں سے متعدد اہم کام جن میں سرفہرست "توسیع مسجد" "دار تحفیظ القرآن الکریم" اور ایک عظیم الشان لائبریری کا قیام ہے (جہاں ان شاء اللہ مطالعہ، بحث و تحقیق اور علمی استفادہ کا اعلیٰ انتظام ہوگا) آغاز کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں سے خواہ وہ اس طویل و عریض ملک کے کسی بھی علاقے کے ہوں ہماری مکرر درخواست ہے کہ وہ اس کام کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کو اپنا ہی کام سمجھیں۔ ہمیں یقین اور اللہ تعالیٰ کی ذات عالی پر پورا بھروسہ ہے کہ ان شاء اللہ مولانا مدظلہٗ کی بیش قیمت و بابرکت رہنمائی و نظامت میں اگر احباب و مخلصین نے پوری دلچسپی لی تو ہمارا یہ پیغام نہ صرف ملک کے گوشہ گوشہ بلکہ عالم اسلام کے کونے کونے میں پہونچے گا۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

(مولانا) معین اللہ ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) | (مولانا) محب اللہ لاری ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء)

(جناب) مصباح الدین نقوی (معتمد مال ندوۃ العلماء)

نوٹ: چک، ڈرافٹ، منی آرڈر مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔ جو رقم جس مد کی ہو اس کی صراحت ضروری ہے، چک یا ڈرافٹ پر صرف یہ لکھئے:۔
ناظم ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس ۹۳، ندوہ لکھنؤ ۷

سرزمین رنگ و بو لکھنؤ کے مسحور کن عطریات
شمامۃ العنبر | زعفرانی حنا
کارخانہ
محمد سلیمان محمد یوسف پرفیومرس
یوسف بلڈنگ نادان محل روڈ لکھنؤ (انڈیا) سے طلب کریں۔

لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۸ | ۱۰ اگست ۱۹۸۱ء ــــ ۹ شوال ۱۴۰۱ھ | شمارہ نمبر ۱۹

زرِ تعاون

اندرون ملک ــــ بیس روپے

فی پرچہ ــــ ایک روپیہ

بیرون ملک۔ بحری ڈاک بحوالہ ۵ پونڈ
ہوائی ڈاک

ایشیائی ممالک ــــ ۷ پونڈ

افریقی ممالک ــــ ۸ پونڈ

یورپ وامریکہ ــــ ۱۰ پونڈ

اداریہ

اپنے جہاں کا جائزہ

رمضان کا مہینہ ختم ہوا، عید بھی آئی اور گزر گئی، زندگی اپنی پرانی ڈگر پر آگئی، دنیا اللہ کے خوش قسمت بندوں سے خالی نہیں ہے، اللہ کے بہتیرے بندے ایسے ہوں گے جنھوں نے رمضان کے 'مدرسۂ تربیتِ روح' سے فیض اٹھایا ہوگا، ان کے اندر خداترسی کی وہ کیفیت پیدا ہوگئی ہوگی جو سال کے گیارہ مہینے تک ان کو سنبھالے رکھے، تقویٰ کا یہ اندوختہ غیر رمضان کے لئے حاصل کیا گیا تھا، رمضان جمع کرنے اور اکٹھا کرنے کا زمانہ تھا۔ رمضان کے بعد آنے والے شب و روز اسی جمع شدہ دولت سے نفع اٹھانے کا زمانہ ہیں مگر جو عین بارش کے زمانہ میں تشنہ کام رہا ہو، جس کا 'مزرعِ وجود' عین موسم بہار میں بھی خشک اور پیاسا رہا ہو۔ اس کی تشنہ لبی خزاں میں کسی درجہ بڑھی ہوئی ہوگی، اس کی روح قحط کے عالم میں کس درجہ نڈھال ہوگی، اس کا اندازہ کیجئے اور وہ دعا پڑھئے جو کسی جسمانی عیب رکھنے والے مریض کو دیکھ کر پڑھی جاتی ہے۔

الحمد للہ الذی عافانا مما ابتلاہ بہ غیرنا و فضلنا علی کثیر من عبادہٖ تفضیلا۔ اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اس عیب سے محفوظ رکھا جس میں دوسرا مبتلا ہے اور اپنے بہتیرے بندوں سے اچھا بنایا۔

یوں ہم بھی کس درجہ تندرست ہیں اور ہم نے اس موسم برشگال میں کتنے قطرے جمع کر رکھے ہیں وہ تو کچھ ہمارا ضمیر ہی جانتا ہے، اللہ کی ستاری کی بات اور ہے ورنہ ہم و شما سب کے سب "خودی ناشناسے زخودبے خبر" کا مصداق ہیں۔

رمضان کے اس مبارک مہینہ نے ہمیں کس حال میں چھوڑا، یہ جائزہ لینے اور محاسبہ کرنے کا موضوع ہے۔ افراد کو چھوڑیئے کہ بل الانسان علی نفسہٖ بصیرۃ آدمی اپنے آپ کو خوب پہچانتا ہے، ولو القیٰ معاذیرہ خواہ وہ کتنے ہی حیلے بہانے پیش کرے۔ جہاں تک اجتماعی حالات کا تعلق ہے تو اس کے متعلق کیا عرض کروں،

ہم خوش کبھی رہے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں سبب گلۂ روزگار کا

عالم اسلام ٹکڑوں میں بٹا ہوا تو پہلے ہی سے ہے، اب یہ ٹکڑے آپس میں برسرپیکار بھی ہیں، دین کو چھوڑ کر خالص مادی خطوط پر کا تجربہ بھی تمام مسلم ممالک کو مہنگا پڑا، جس ملک نے امریکہ کو اپنا پشت پناہ سمجھا اس کی پشت پر چھرے کا سب سے بڑا نشان امریکی سیاست کا پڑا، جس نے روس کو اپنا پشت پناہ اور کارساز سمجھا اس کو سب سے بڑی رسوائی روس ہی کے ہاتھ ہوئی۔ پاکستان اور مصر کی مثالیں تازہ ہیں ابھی ان پر بہت دن نہیں گزرے۔

شام و عراق نے کھلم کھلا خدا بیزاری، دین بیزاری اور انسانیت بیزاری کا فلسفہ اپنایا، مگر دونوں چھوٹے چھوٹے ملک (جو ہندوستان کے ایک ضلع سے بھی چھوٹے ہوں گے) آپس ہی الجھ پڑے، عراق کی ایران سے جنگ ہے، ایران کی خلیج کی ریاستوں سے جنگ ہے، الجزائر کی مراکش سے لڑائی ہے اور لیبیا کی (بقول ایک مصری اخبار نویس کے) ساری خدائی سے جنگ ہے۔

مصر کو عرب ممالک نے اپنے جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا ہے اور مصر نے، بقول اسکے صدر چھپے یہودیوں کی دوستی کے بجائے کھلے یہودیوں سے دوستی کر لی ہے، شام میں بے دردی سے مسلمان قتل کئے جا رہے ہیں، کوئی کلمہ گو اور کوئی اسلام کی حقانیت پر ایمان رکھنے والا ایسا نہیں ہے جو اس دُرندگی سفاک کا ستم رسیدہ نہ ہو۔ افغانستان کے مجاہدین اپنے خون سے اپنے ملک کی نئی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ وقت کی سب سے بڑی دجالی جبروت سے ان کا مقابلہ ہے، مگر لیبیا، شام، عراق، عدن آج بھی اسی دجالی جبروت کے کولھو میں اُن بیلوں کی طرح گردش کر رہے ہیں جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی ہیں۔ آنکھوں پر پٹی نہیں۔ دل کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے،

انہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

(بقیہ ص ۱۳ پر)

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا خادم ندوۃ العلماء کا ترجمان آپکی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ بیس روپے ارسال فرمایئے۔ اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی۔ پی ہی سے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ مع وی۔ پی خرچ Rs. 23/25 کے مطالبہ میں وی۔ پی سے روانہ ہوگا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

کتاب و سنت سے

خوش خلقی و نیک خوئی

آیات:

إِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ۔ (سورۂ قلم آیت ۴) — بیشک آپ اخلاق کے بلند معیار پر ہیں

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ (سورۂ آل عمران آیت ۱۳۴) — غصہ کو روکنے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور خدا نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔ (سورۂ لقمان آیت ۱۸) — اور (از راہ غرور) لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین میں اکڑ کر نہ چلنا، کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بہتر اخلاق والے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی سے زیادہ ملائم مجھے دیباج ریشم بھی نہیں معلوم ہوا اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو سے بڑھ کر میں نے کوئی خوشبو ہی سونگھی، میں نے ۱۰ سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی اس عرصہ میں مجھے اف تک نہ فرمایا، نہ میرے کسی کام کے بارے میں یہ فرمایا کہ تم نے کیوں کیا؟ اور اگر کسی کام کو نہیں کیا تو یہ نہ فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ (متفق علیہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ کی ایک معمولی عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جدھر چاہتی لے جاتی۔ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا، اور فرمایا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی۔ (متفق علیہ)

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا نیکی تو حسن اخلاق ہے اور گناہ ہر وہ بات ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم یہ ناپسند کرو کہ دوسروں کو اس کا علم ہو۔ (مسلم)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ مزاجاً فحش گو تھے اور نہ بتکلف ہی ایسا فرماتے تھے، اور آپ فرمایا کرتے تھے تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔ (متفق علیہ)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن مسلمان کے ترازو میں اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی اور عمل نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ فحش گو اور ناشائستہ بات کرنے والے سے ناراض ہوتا ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل لوگوں کو زیادہ جنت میں داخل کرے گا؟ آپ نے فرمایا خدا کا پاس و لحاظ اور خوش اخلاقی۔ پھر دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل لوگوں کو زیادہ جہنم میں داخلہ کا سبب ہوگا؟ آپ نے فرمایا زبان اور شرمگاہ۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے زیادہ مکمل ایمان والا وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے لئے سب سے بہتر ہو۔ (ترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ مسلمان اپنے اخلاق سے روزہ دار و تہجد گذار کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ (ابو داؤد)

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بحث مباحثہ میں الجھنے کو ترک کر دیا خواہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو میں اس کے لئے جنت کے آس پاس گھر دلانے کا ضامن ہوں، اور جس شخص نے جھوٹ کو ترک کیا خواہ مذاق ہی میں کیوں نہ ہو میں اس کے لئے جنت کے اندر مکان دلانے کا ضامن ہوں، اور جس کے اخلاق اچھے ہوں میں اس کو جنت کے اندر اعلیٰ علیین میں مکان دلانے کا ضامن ہوں۔ (ابو داؤد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن تم میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب اور مجھ سے قریب وہ شخص ہوگا جس کے اخلاق تم میں سب سے اچھے ہوں گے اور قیامت کے دن میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور مجھ سے دور تم میں وہ لوگ ہوں گے جو بتکلف خوب باتیں کرتے ہیں اور حق سے تجاوز کر جاتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر بات کرنے والے، بتکلف فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرنے والے، اپنی فضیلت و برتری کو ظاہر کرنے کے لئے زور زور سے باتیں کرنے والے۔ (ترمذی)

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی فرمائی ہے کہ تم تواضع و خاکساری ظاہر کرو کہ کوئی کسی پر غرور و گھمنڈ کا مظاہرہ نہ کرے نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا، معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ بندہ کی عزت کو بڑھاتا ہے۔ جو بندہ بھی اللہ کی خاطر تواضع برتتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند فرماتے ہیں۔ (مسلم)

نعت صلی اللہ علیہ وسلم

تسنیم فاروقی

جو مانگ رہے ہیں ہم سرکار عطا کیجے
آنکھوں کو مدینے کا دیدار عطا کیجے

سب غم کے اندھیرے میں سہمے ہوئے بیٹھے ہیں
طوفان میں کشتی ہے پتوار عطا کیجے

جو سانس ہماری ہو معبود کو پیاری ہو
سرکار ہمیں اپنا کردار عطا کیجے

جھوٹ اور تعصب کا پتھراؤ ہے ہر جانب
سچائی کے ہاتھوں کو تلوار عطا کیجے

جی بھر کے سنالیں ہم افسانۂ بربادی
ہم کو بھی کوئی موقع اک بار عطا کیجے

وہ آپ کی محفل کے جو چار ستارے ہیں
ان چاروں کی یادوں کا سنسار عطا کیجے

جاں پیش کریں ہنس کر توحید کی وادی میں
ہم کو وہ رسن دیجے وہ دار عطا کیجے

سب اس کو پکار اٹھیں سرکار کا دیوانہ
تسنیم کو طیبہ کا بازار عطا کیجے

ایک یادگار استقبالیہ

تعمیر حیات کے گذشتہ شماروں میں استاذ کبیر مولانا محمد ناظم ندوی کی تشریف آوری کا ذکر آچکا ہے۔ مولانا ندوہ کے مایہ ناز فرزند ہیں۔ یہاں کے شیخ الادب اور مہتمم بھی رہ چکے ہیں، جامعہ عباسیہ بھاولپور کے وائس چانسلر اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ادب و بلاغت کے استاذ تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب خطبات مدراس کا عربی میں ترجمہ آپ ہی نے کیا ہے جس کا تذکرہ سیمنار میں آنے والے بعض اساتذۂ ادب نے بڑے جوش و احترام کے ساتھ کیا اور جس کے متعلق شام یونیورسٹی کے پروفیسر راتب النفاخ نے لکھا کہ سیرت نبویہ کو پیش کرنے کا یہ اچھوتا انداز ہم عرب اساتذہ کے لئے قابل تقلید ہے۔ استاذ گرامی مولانا محمد ناظم ندوی موجودہ تمام ندوی اساتذہ ادب کے استاذ ہیں اور مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے زمانہ درس کے ساتھی زمانہ تدریس کے رفیق اور ایک دوسرے کے انتہائی قدر داں اور معترف ہیں۔ ندوہ کا جب مذاکرہ علمیہ ختم ہوگیا اور مہمان اپنے اپنے وطن جا چکے اور مولانا محمد ناظم مدظلہ بھی اپنے اعزہ سے مل کر دوبارہ ندوہ آئے تو طلباء اور اساتذہ نے ان کے استقبال میں خصوصی جلسے کئے، دعوتوں کا سلسلہ رہا۔ اساتذہ نے اپنی طرف سے، طلبہ نے اپنی جانب سے، حضرت مولانا نے اپنی طرف سے اور بعض شاگردوں نے خصوصی دعوتیں کیں۔ ان جلسوں میں انجمن الاصلاح کی دعوت اور جلسۂ استقبالیہ قابل ذکر ہے، دارالعلوم کے ہونہار طالب علم مولوی شعیب اسلم ناظم الاصلاح نے اس موقع پر جو سپاس نامہ پیش کیا وہ پچھلے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ آج ہم وہ دو تقریریں شائع کر رہے ہیں، ان میں ایک حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ہے جو انھوں نے تعارف و خیر مقدم کے طور پر کی تھی اور دوسری تقریر جو مولانا محمد ناظم ندوی نے اس کے جواب میں کی تھی یہ دونوں تقریریں ٹیپ کی مدد سے شاہ ابو دجانہ تسنیم نے قلمبند کی ہیں۔ ——— (ادارہ)

خیر مقدم و تعارف

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

میرے عزیزو دوستو! کسی ایسے عزیز رفیق اور دوست کے متعلق جس کے ساتھ سالہا سال رہنا ہوا ہو، شب و روز گذرے ہوں، سفر اور حضر میں اور درس کے حلقوں میں اور کی صحبتوں میں ۲۴ گھنٹے رہنا ہوا ہو، اس کے متعلق کہنا بظاہر تو بہت آسان ہے کہ ایک دفتر کھلا ہوا ہے اور سب نگاہوں کے سامنے ہے لیکن مشکل بھی بہت ہے ابھی کچھ عرصہ پہلے مولانا کا عربی دیوان بھی شائع ہوا جس کے چند ہی نسخے وہ اپنے ساتھ لائے پائے تھے انھوں نے ازراہ کرم اور اپنی پرانی دوستی اور رفاقت کی بنا پر مجھ سے خواہش کی کہ میں اس پر مقدمہ لکھوں،

میں نے اس مقدمہ میں اسی مشکل کا اظہار کیا ہے کہ جب اس پچھلے دور کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو یادوں کی ایک بارات، یادوں کی ایک دنیا سامنے آجاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو لیا جائے کس کو چھوڑا جائے۔ جیسے میرے اور مولانا ناظم صاحب ندوی کی رفاقت کے دن گزرے ہیں، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ دو طالب علم اور ایک جگہ درس دینے والے اور خدمت کرنے والے اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر رہے ہوں۔ ہم اپنی زندگی اور اپنی دوستی کا آغاز اسی دارالاقامہ (شبلی) سے کیا غالباً اس بازو کا آخری کمرہ یعنی اس ہال سے اس طرف کا کمرہ (دفتر) وہاں ہمارے اور آپ کے مشترک دوست مولانا مسعود عالم ندوی رہا کرتے تھے۔ کیا کہوں کہ ان کی یاد سے دل پر کیا گزرتی ہے اور کیسے نقوش ابھر آتے ہیں میرے آنے کا راستہ بھی یہی تھا۔ مجھے ایک سبق فقہ کا مولانا شبلی صاحبؒ سے پڑھنا ہوتا تھا، وہ بالکل اسی سلسلے کی اس قطار کے آخری کمرے میں رہتے تھے۔ میرا معمول تھا کہ میں مولانا مسعود عالم صاحب کو سلام کرتا اور چند منٹ ان کے پاس گزارتا ہوا آتا۔ میرے لئے وہاں کشش کی بات یہ تھی کہ ان کے پاس عربی رسائل رکھے ہوتے تھے اور ہم دونوں کا ذوق مشترک تھا۔ اس کے بعد دوستوں کے اس چھوٹے سے مجموعہ میں ایک وقیع اضافہ ہوا۔ مولانا ناظم صاحب ندوی کا اور جب یہاں آئے تو اس وقت عربی رسالہ کا اجراء ہندوستان میں ایک بڑی بلند پروازی تھی اور ایک گویا عنقا شکار تھا تو انھوں نے "القائد" کے نام سے عربی کا ایک رسالہ نکالنا شروع کیا اس میں شرط یہ تھی کہ ہر مضمون نگار اپنے قلم سے اپنا مضمون لکھ کر اس میں شامل کرے۔ کچھ پرچے شاید اب بھی یہاں الاصلاح میں ہوں گے تو اس میں پیش پیش ہم ہی دو تھے۔ اس زمانے میں عربی زبان کا ذوق اور ادب، اس کو بیماری کہئے یا جراثیم ہم تین میں زیادہ تھے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم، میں اور مولانا ناظم صاحب اس وقت "الضیاء" کا خواب بھی ہم لوگ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پھر روز بروز یہ رفاقت بڑھتی گئی یہاں تک کہ درس میں باقاعدہ شمولیت میرا اور مولانا کا آخری درجوں میں دو سال ساتھ رہا اور اس سے رفاقت کا رشتہ اور مضبوط ہوا پھر وہ وقت آیا کہ مولانا مسعود علی صاحب مرحوم نے مسجد کی تعمیر کے لئے مستقل قیام اختیار کیا۔ مولانا مسعود علی صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مردم شناسی عطا فرمائی تھی۔ مسجد کیا بن رہی تھی گویا دارالعلوم کی ترقی کے نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ درحقیقت دارالعلوم کا نیا ڈھانچہ تیار ہو رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نئے ڈھانچے اور ندوۃ العلماء کے اس نئے دور کا آغاز خانۂ خدا سے ہوا یہ مسجد صرف اپنے نماز اور تلاوت قرآن ہی کی حیثیت سے بابرکت اور ایک مبارک ثابت نہیں ہوئی بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اسی سے ایک نئے دور کی بنیاد پڑی۔ مولانا مسعود علی صاحب مرحوم کے پاس جو لوگ زیادہ اٹھا بیٹھا کرتے تھے ان میں مولانا عمران خاں صاحب ندوی، مولانا مسعود عالم صاحب، مولانا محمد ناظم صاحب اور مولانا محب اللہ صاحب بھی اسی دور کے ہیں جو کچھ ذوق رکھتے تھے وہ اپنے بزرگوں سے ضرور واقف تھے یہ وہ دور تھا کہ جب یہاں کے اساتذہ کی ایک نسل کے زندگی کی شام ہو چکی تھی مولانا مسعود علی صاحب مرحوم کی نگاہ اس مسجد کے دوران تعمیر کام کرتی رہی کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں کہ جو اب ان کی جگہ لیں اور وہ دارالعلوم کو ترقی دیں تو ان کی نگاہ انتخاب ان چار آدمیوں پر پڑی مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم الضیاء نکال چکے تھے۔ اور مولانا محمد عمران صاحب بحیثیت دفتر اور اہتمام وغیرہ کے اور تدریس کے لحاظ سے مولانا ناظم صاحب ہیں اور مولانا عبدالسلام صاحب پر ان کی نگاہ پڑی۔ اسی دوران میں یعنی غالباً ۱۹۳۰ء میں ہمارے اور مولانا ناظم صاحب کے استاد علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی ایک نعمت غیر مترقبہ بنکر ہندوستان اور پھر اس کے بعد لکھنؤ آئے تو اس وقت آپ کو بتانا مشکل ہے کہ ہلالی صاحب کی آمد سے کیا فائدہ پہونچا اور کیسی ایک نئی نسل تیار ہو گئی وہ گویا ایک عہد کے بانی تھے۔ وہ یہاں دو تین سال رہے مگر ان کے اوقات کا طول ہی نہیں عرض بھی تھا اور وہ عرض غالباً ان کے اوقات کے طول سے زیادہ طویل تھا اور عمق بھی تھا۔ طول و عرض و عمق۔ یہی چیزیں ہوتی ہیں۔ طول کے لحاظ سے کوئی بڑی مدت نہیں تھے لیکن عرض اور عمق کے لحاظ سے وہ بڑی مدت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑا فائدہ پہونچایا ان کی خاص شفقت کی نگاہ تین طالبعلموں پر تھی۔ مولانا مسعود عالم صاحب درجہ اول میں پھر مولانا ناظم صاحب، اور پھر یہ ناچیز۔ ہلالی صاحب کی جوہر شناس نگاہ کہیئے یا علم آموز نگاہ کہیئے، ادب آموز نگاہ کہیئے وہ ہم تینوں پر ایسی پڑی کہ جم کر، گڑ کر رہ گئی، ہمارے دل و دماغ میں آ رہی مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ وہ کانپور جا رہے تھے تو مولانا مسعود عالم صاحب اور میں . . . ان کے ساتھ ہو گئے اس زمانہ میں گاڑی بہت خالی جاتی تھی اور غالباً تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا اس میں بس ہم چار پانچ ہی

آدمی تھے مولانا مسعود عالم صاحب نے شاید فرمائش کی یا ہم میں سے کسی کا جی چاہا اپنے اپنے پسندیدہ اشعار عربی میں سنانے شروع کئے۔ مولانا مسعود عالم صاحب نے منتخب شعر سنائے۔ میں نے شعر سنائے تو ہلالی صاحب نے سننے کے بعد کہا کہ دیکھو کسی عجمی ملک میں عربی کا جو بہتر سے بہتر ذوق ہو سکتا ہے وہ تم لوگوں نے پیدا کر لیا۔ یہ ان کی سند ہے۔ کسی غیر عربی ملک میں جو زیادہ سے زیادہ عربی زبان و ادب کا ذوق پیدا کیا جا سکتا ہے وہ خدا نے تم لوگوں کو دیا ہے۔ لوگوں کی الحمد للہ اس وقت جیسے آجکل بہت سے دلچسپیاں ہیں اس وقت دلچسپیاں کم نہیں تھیں بلکہ زیادہ تھیں۔ اور یہاں کی زندگی، ہمارے دارالعلوم کے اندر کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز بڑی تلاطم والی زندگی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ ہم تینوں ان سے وابستہ ہو گئے اور چمٹ گئے اور ان سے درس کے علاوہ بھی استفادہ کرنا اور جو کچھ کہیں اس کو غور سے سننا اور اس کا لینا اور پھر اس کو لکھنا اور ہم نے تو اس کے امالی بھی لکھے ہیں۔ یہ ایک نیا رشتہ ہم لوگوں کے درمیان قائم ہوا اس کے بعد مولانا مسعود علی صاحب نے ایک دن مجھے بلایا۔ شاید مولانا ناظم صاحب کو بھی نہ معلوم ہو۔ اوپر چھت پر بیٹھے ہوئے وہ مسجد کی نگرانی کر رہے تھے۔ کہنے لگے یہاں آؤ مجھے بلایا اور کہا دیکھو یہ بڑے بوڑھے لوگ چل دیں گے اب تم لوگوں کو جگہ لینی چاہیئے اور تم لوگ اب اس دارالعلوم کی خدمت کا ارادہ کرو اور اس کے بعد انھوں نے مشورہ دیا اور اس وقت الحمد للہ بڑا ایک اتحاد قائم ہو گیا تھا اگرچہ وہ لفظ تو اس کے لئے اچھا نہیں۔ اتحاد ثلاثہ لیکن حقیقت میں وہ اتحاد ثلاثہ تھا مولانا سید سلیمان ندوی میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم اور مولانا مسعود علی صاحب یہ تینوں ندوۃ العلماء کی پالیسی اور ندوۃ العلماء کے نظام کے مالک بن گئے اور ہماری مجلس منتظمہ ہمیشہ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل رہا کہ ایک مختصر دور کے بعد پھر مجلس منتظمہ نے ندوہ کا سارا کام ان چند آدمیوں مولانا سید سلیمان ندوی بحیثیت معتمد دارالعلوم اور بحیثیت نگران اعلیٰ اور سرپرست اور مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب میرے بڑے بھائی بحیثیت ناظم، ان کو پورا اعتماد تھا اور اس وقت ندوہ کا جو پورا کام چلا اور آج بھی الحمد للہ جو تھوڑی سی سہولت ہے اسی کی برکت ہے۔ آپ کو بتاتا ہوں آپ کو بھی معلوم نہیں کتنے اداروں کا ناظم بننا ہو۔ مجالس انتظامی کے آپ رکن نہیں یہ بہت بڑا اللہ کا فضل ہے کہ اعتماد پیدا ہو جائے مختصراً تین آدمی اس وقت دارالعلوم کے گویا ملاح تھے، کھیون ہار تھے۔ ان حضرات نے یہ طے کیا کہ نیا خون آنا چاہیئے اس جسم میں نیا خون داخل کرنا چاہیئے مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم الضیاء نکالتے تھے اس کے بعد پھر اسی دوران میں ان کو تدریس میں بھی لے لیا گیا اور میرا اور مولانا عبدالسلام صاحب اور مولانا ناظم صاحب کا اس میں اضافہ ہوا پھر اس کے بعد تو ایسی رفاقت ہوئی کہ ۲۴ گھنٹے اور اس وقت یہ بھی بتا دیں کہ اس زمانہ میں ہم لوگوں کی تنخواہیں کیا تھیں، ہمارا تقرر ۳۰ روپے سے ہوا تھا۔ اور میری ملازمت کی زندگی کا اختتام ۷۰ روپے پر ہوگیا لیکن مولانا ناظم صاحب جب یہاں سے پاکستان گئے تو مولانا کو شاید یہاں ۸۰ روپے مل رہے تھے تو وہاں سے اپنے دوستوں کو خط لکھا کہ اس میں صرف ایک صفر کا اضافہ ہوا ہے۔ کیسا مبارک صفر تھا یعنی وہ صفر آپ نے ایسا کہا گویا کہ کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ یہاں آپ کو ۸۰ مل رہے تھے وہاں آپ کو آٹھ سو ملنے لگے۔ آپ جامعہ عباسیہ کے جاتے ہی شیخ ہو گئے یعنی وائس چانسلر۔

پھر میں نے دہلی سے آکر یہاں تبلیغ کے سلسلہ کا آغاز کیا اساتذہ میں سب سے پہلے مولانا محمد ناظم صاحب نے ساتھ دیا۔ اور ہم لوگ یہاں سے پیدل جایا کرتے تھے آٹھ آٹھ میل دس دس میل پر جا کر قیام کرتے تھے اور وہاں دعوت کا کام کرتے تھے اس میں مولانا کا یہاں بھی ساتھ رہا بیرونی سفروں میں بھی ساتھ رہا۔ اس کے بعد پھر وہ وقت آیا کہ حالات نے ہم کو اور مولانا کو جدا کر دیا قلبی حیثیت سے روحانی حیثیت سے، علمی اور ذہنی حیثیت سے تو نہیں لیکن جسمانی حیثیت سے ضرور بہت بڑا فاصلہ پیدا کر دیا۔ میں عرصہ کے بعد جب کراچی گیا تو مولانا نے اپنے یہاں بڑے اہتمام سے ایک جلسہ استقبالیہ منعقد کیا اس میں مولوی معین اللہ صاحب بھی تھے، میرے مرحوم بھتیجے محمد میاں اور مولانا اسحٰق صاحب مرحوم بھی تھے اور مولانا نے میرے تعارف میں یا استقبال میں تقریر کی میں نے اس کا جواب دیا میں نے بتایا کہ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے کیا خصوصیات عطا کی ہیں اور کن چیزوں میں وہ فائق ہیں اس کو میں نے تفصیل سے بیان کیا اور یہاں بھی بیان کر چکا ہوں۔

اب اس وقت آپ سے ایک بات پیغام کے طور پر ایک نتیجہ کے طور پر کہتا ہوں، اور زندگی کا ایک تجربہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں جس کے دو نہیں بلکہ کئی گواہ یہاں موجود ہیں اور اس جگہ پر ہم تین جو ایک قطار میں یہاں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس وقت اسٹیج پر ایک قطار میں حضرت مولانا، مولانا ناظم صاحب ندوی اور مولانا محب اللہ صاحب ندوی مہتمم دارالعلوم تھے) وہ تو بالکل اس کے پورے گواہ ہیں اور خدا کے فضل سے دائیں بائیں بھی ایسے لوگ ملیں گے۔

میرے عزیزو! تم سے کہتا ہوں کہ سارا دارومدار اپنی محنت اور لیاقت پر ہے کوئی اضافی چیز کوئی خارجی چیز آدمی کو نہ عالم بنا سکتی ہے نہ ادیب بنا سکتی ہے اور نہ زندگی میں کامیاب بنا سکتی ہے یہ سب اس عہد کے دھوکے ہیں ہمیشہ سے حقیقت ایک رہی ہے اور اس کو سیدنا علی مرتضیٰؓ نے اپنے بیان میں بلیغ انداز میں پیش کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اور کوئی کلام ہو نہ ہو اس کی نسبت صحیح ہو نہ ہو لیکن اس کی کچھ ایسے جملے ضرور ہیں جو یقیناً علی مرتضیٰ کی زبان سے نکلے، ان میں سے ایک جملہ "قیمۃ کل امرء ما یحسنہ" اگر میرا بس چلے تو یہاں پر لکھ کر میں لگا دوں مگر اس کی شرح چاہیئے۔ ہر شخص کی قیمت وہ ہے جو کام وہ دوسروں کے مقابلہ میں اور اپنے دوسرے کمالات کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے۔ انسان کا جوہر وہ ہے جس میں وہ دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہے اور اپنی دوسری چیزوں میں اس کو شارکت حاصل ہے ایک آدمی دس چیزیں جانتا ہے۔ خوش نویس بھی ہے، قاری بھی ہے خوش آواز بھی ہے ادیب بھی ہے کچھ حدیث و تفسیر سے بھی مناسبت ہے لیکن اصل جوہر مرکزی فن وہ ہے جس میں اس کو امتیاز حاصل ہے اپنی ذات میں بھی اور دوسروں کے مقابلہ بھی تو اس کو کسی سفارش کی کسی خارجی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں ہم دونوں آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اب میں ذرا صفائی کے ساتھ بالکل جیسے کوئی بات بےجھجک کہی جاتی ہے کہتا ہوں ہم دونوں نے ممالک عربیہ کی سرزمین پر اس وقت قدم رکھا ہے جو کچھ ہم کو بننا تھا بن چکے تھے۔ ہمارا ساںچہ پختہ ہو چکا تھا۔ مولانا کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مولانا ۱۹۵۰ء میں گئے ہیں اور میں ۱۹۴۷ء میں گیا ہوں لیکن ۱۹۵۱ء میں اس حال میں گیا کہ عربوں کے سامنے تقریر کرنا تھا اور تھوڑے دنوں کے بعد میری کتابیں چھپ کر مصر سے آگئیں "ماذا خسر العالم . . ." ۱۹۵۰ء میں چھپی ہے ہم کو جو کچھ بننا تھا اور جو کچھ حاصل کرنا تھا سب یہیں حاصل کیا اور سوائے اس کے کہ بیشک ہلالی صاحب یہاں آئے اور وہ بہت بڑے زبان کے مزاج داں، نباض، اور میری خوش قسمتی اس میں زیادہ ہے کہ مجھے شروع ہی میں عرب استاد ملے۔ لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے تو صدہا شاگرد ہیں۔ ہمارے استاد خلیل عرب صاحب کے صدہا شاگرد ہوں گے وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں برسوں سے پڑھا رہے تھے اور ہر سال ان کو بی۔اے، ایم۔اے کی کلاسیں ملتی تھیں اور خود ان کے گھر کا جو مدرسہ تھا اس میں بھی درجنوں آدمی آئے اور پڑھ کر گئے لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ بات اصل یہ ہے کہ جو آدمی شروع میں محنت کرے اور کسی چیز میں پختگی پیدا کرے اور اس پر وہ تھوڑی سی قربانی دے دے یعنی کچھ تکلیف اٹھا کر اور اپنی صحت کو خطرے میں ڈال کر اور دنیا سے آنکھیں بند کر کے ہر انعام ہر تعریف ہر اعتراف سے بالکل مستغنی ہو کر اپنے ذوق سے اندرونی جذبہ سے اگر کام میں لگ جائے تو اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں تو مولانا محمد ناظم صاحب یہاں سے پاکستان گئے تو بہت بڑے دینی و علمی مرکز جامعہ عباسیہ میں وائس چانسلر بن گئے۔ اور کسی نے نہیں پوچھا کہ آپ مصر میں کتنے دن رہے آپ نے ازہر میں پڑھا

ہے یا نہیں، آپ نے کسی عرب جامعہ سے سند حاصل کی، آپ نے وہاں کتنے دن ٹریننگ حاصل کی کسی نے نہیں پوچھا۔ اصل چیز یہ ہے کہ آدمی سبق کیسا پڑھاتا ہے، کتاب کیسی سمجھاتا ہے، اپنے مطلب کو تحریری، تقریری طریقہ پر کتنی قدرت کے ساتھ، کتنی کامیابی کے ساتھ ادا کرتا ہے اور طلبہ کو اس سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اسی کو سرمایہ، پونجی سمجھو۔ ہم تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جب گیا اور اپنے ان ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ گیا، لیکن الحمد للہ گیا تو وہاں داعی کی حیثیت سے گیا، وہاں ایک مصنف کی حیثیت سے گیا، ہر موضوع پر گفتگو کرنے کی پوزیشن میں، ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد، طٰہ حسین، محمد حسین، توفیق الحکیم، ان میں سوائے طٰہ حسین کے باقی میں سب سے ملا ہوں، اور ڈاکٹر احمد امین سے میری جو باتیں ہوئیں وہ آپ مذکرات میں پڑھیں، تو ایک اتنا جو بڑا آدمی جس کی ساری عمر گویا عجمی نژاد ہے ہندوستان میں اس نے پڑھا ہے۔ وہ نابغۂ شرق عربی سے ملا ہے۔ آپ دیکھیں کہ ان کا جو مقام تھا وہ تھا لیکن اگر میں ان سے دو سوال کرتا تھا تو ایک سوال وہ مجھ سے بھی کرتے تھے، کچھ چیزیں ایسی تھیں جو وہ مجھ سے پوچھتے تھے اور بہت زیادہ چیزیں ایسی تھیں جن میں میں ان سے استفادہ کرتا تھا لیکن ایسا نہیں تھا جیسے کوئی شاگرد رشید یا کوئی [illegible] کسی عملاق کے پاس چلا جائے یہ صورت نہیں تھی یہ کس بات کا نتیجہ تھا، یہ یہاں کی تعلیم کا نتیجہ تھا جو خود اعتمادی پیدا کرتی تھی، ہمارے دار العلوم میں اور کچھ ہو نہ ہو لیکن اس زمانہ میں الحمد للہ دار العلوم میں ایک بہت بڑی چیز تھی جو ذرا کم ہو رہی ہے اور اس کی حفاظت کی ضرورت ہے وہ ہے اپنی درسگاہ پر فخر، اپنے اساتذہ پر فخر، اپنے اسلاف پر فخر۔ وہ فخر نہیں جس میں دوسروں کی حق تلفی ہو عصبیت ہو۔ بلکہ یہ کہ ان کا ایک مقام تھا، انھوں نے جو فکر دیا ہے وہ فکر بہت آگے کا ہے اب بھی بہت سے ممالک وہاں تک نہیں پہونچے یا جس کو انگریزی میں "سنس آف پرائڈ" کہتے ہیں یعنی اپنی درسگاہ پر ناز یہ بات تھی اور میں الحمد للہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے علاوہ بھی گھر کی صحبت نصیب فرمائی اور خاص طور پر میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم ان کی صحبت میں بیٹھ کر ایسا ذہن بن گیا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے آنکھ جھپکتی نہیں تھی اس لئے کہ وہ جدید تعلیم کے بھی اعلیٰ نمونہ تھے اور قدیم تعلیم میں بھی بہت راسخ یعنی یہ سمجھئے کہ میں نے ان سے عربی بھی پڑھی ہے میں نے ان سے مجموعۃ النظم والنثر کا بھی کچھ حصہ پڑھا ہے میں نے دیکھا کہ ان کی صرف ونحو کی استعداد اتنی پختہ تھی اور عربیت ان کی اتنی اچھی تھی کہ میں نے کم آدمیوں کی دیکھی ہے اور اطمینان سے وہ مجھے ادب کی چیزیں پڑھاتے تھے۔ اور اخبار دیکھنا تو میں نے انھیں سے سیکھا۔ میں اس وقت خلیل عرب صاحب سے نہج البلاغہ اور مقامات حریری وغیرہ پڑھ چکا تھا اور میں نے جو عربی اخبارات دیکھنا شروع کئے تو معلوم ہوئے کہ کسی دوسری زبان میں ہیں۔ اس لئے کہ اس میں جو تعبیرات تھیں وہ بالکل میرے لئے نامانوس تھیں۔ تو بھائی صاحب سے میں سمجھتا تھا کہ اس کا کیا مطلب تو میں نے اخبار بھی پڑھنا انھیں سے سیکھا۔ پھر میں نے انگریزی بھی ان سے پڑھی تو ہر چیز میں ان کی استعداد تھی، ان کا مزاج ہی یہی تھا کہ جو چیز تھی پختہ تھی اور اس پر اتنا اطمینان تھا خاص طور سے اسلام پر۔ اسلام تو ایک بہت وسیع چیز ہے، شریعت اسلامی اور اسلامی تہذیب اور اسلاف پر اتنا اعتماد تھا کہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اسلاف کو، امت کے اسلاف کو جو چیز عطا فرمائی جو گہرائی اور جو پختگی اور جو بصیرت ہے وہ دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے اور پھر جس طرح وہ مغربی افکار پر تبصرہ کرتے تھے اور مغربی تہذیب پر متوازن اور گہری رائے دیتے تھے اس کی وجہ سے میرے اندر وہ مرعوبیت ختم ہو گئی اور بڑے سے بڑے آدمی کے پاس جا کر میں مرعوب نہیں ہوا یعنی مصر کے چوٹی کے لوگ سے ملا ہوں کہ جن کی تحریریں یہاں پڑھتا تھا اور جھومتا تھا ان سے ملا ہوں، الحمد للہ میں اور مولانا محمد ناظم صاحب جہاں تک عربی زبان وادب کا تعلق ہے اس تعلق سے کہتا ہوں کہ یہ سب دھوکہ ہے نہ کوئی جامعہ کسی کو ادیب بناتا ہے اور نہ کوئی ماحول بناتا ہے اور نہ کہیں کسی عرب ملک میں جانے سے یا کسی یورپین ملک میں جانے سے انگریزی آتی ہے۔ میں نے قاہرہ میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو بارہ بارہ، چودہ چودہ، سولہ سولہ برس سے تھے اور ان کی اس وقت تک عربی صحیح نہیں تھی۔ پتہ لکھتے تھے تو اس میں نحوی غلطی کرتے تھے، بعض فضلاء گئے اور وہاں پڑھانا شروع کیا اور وہ وہاں سے جب پتہ لکھتے تھے تو اس میں میں دو تین غلطیاں پکڑ لیتا تھا، مضاف مضاف الیہ اور صفت موصوف کی غلطیاں ہوتی تھیں اور باقی جو لوگ وہاں تھے وہ عامی جیسی بولتے ہوں لیکن ان کو عربی نہیں آئی تو وہ جو پرانا شعر ہے ذرا سا بے ادبی کر،

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

تو یہ کہیں بھی جانے سے کچھ نہیں ہوتا سب اپنی کمائی، سب اپنی محنت سے ہم دو تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ جتنی دیر تک میں بولا ہوں اس کو کسی نتیجہ پر ختم کروں اور یہی نیت ہے اصل میں تقریب کی کہ اگر تم نے یہ بات سیکھ لی اس وقت مولانا ناظم صاحب کی آمد اس کے لئے اور یہ تقریب اس کے لئے ایک اچھا محرک بن گئی ہے اگر یہ بات تم نے سمجھ لی کہ سب اپنی کمائی ہے اپنی محنت ہے نہ عرب جانے سے کچھ ہوتا ہے نہ عجم جانے سے کچھ ہوتا ہے اگر تمہارے اندر ذوق پیدا ہو گیا تو پھر تم وہاں جاؤ تو فائدہ ہوگا۔ میں اس فائدہ کا انکار نہیں کرتا لیکن یہ ذوق پیدا ہو جانے کے بعد یہ تنقیدی نگاہ پیدا ہو جانے کے بعد۔ اگر جاؤ گے تو پچاس گنا زیادہ فائدہ ہوگا۔ مگر عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ اس دور میں جاتے ہیں جب وہ لوگوں کو تول نہیں سکتے، جانتے نہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے کس میں کیا کمزوریاں ہیں میں جب مصر گیا تو میں طٰہ حسین کو خوب جانتا تھا طٰہ حسین کی خوبیوں کو بھی جانتا تھا طٰہ حسین کی کمزوریوں کو بھی جانتا تھا۔ احمد امین کو پڑھ چکا تھا۔ عقاد کو پڑھ چکا تھا ہیکل کو پڑھ چکا تھا ہم لوگ سب بیٹھتے تھے مولانا مسعود عالم صاحب، مولانا ناظم صاحب ہم لوگ بے تکلف گفتگو کرتے تھے تبصرے کرتے تھے، کتابیں آتی تھیں ان پر تبصرہ لکھتے تھے اور وہ ہماری مجلسوں کا موضوع بنتی تھیں جب میں یہاں سے گیا تو مجھے کوئی نئی چیز معلوم ہی نہیں ہوئی۔ میں اگر یہ کہوں کہ مصر میں جا کر مجھے نئی چیز نہیں ملی صورتیں نئی تھیں لیکن سب جانی پہچانی اور سب کے متعلق ہمارے ذہن میں "لکل امرء شعب من القلب فارغ۔ وموضع نجوی لایرام اطلاعها" وہ صورت تھی کہ ایک مقام تھا ہر ایک کا یہ نہیں کہ کسی کو یہ سمجھ لیا کہ امام وقت ہے،

"بود حکایت دراز ترگفتم" یہ بات یاد رکھو میرے عزیزو کہ سب یہیں تم بن سکتے ہو۔ اور یہاں رہنا بالکل کافی ہے۔ حافظہ پر زور ڈال کر بتاؤ کہ باہر جانے والوں میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی کتابیں عالم عربی میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں جن کو عالم عربی نے مانا ہو اور میں بتا دوں دس نام کہ جنھوں نے جو کچھ سیکھا پڑھا یہیں اور خدا کے فضل سے علماء عرب، ادباء عرب بھی ان کی کتابیں پڑھتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں۔ بس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سب اپنی محنت اپنا کرنا اپنا بھرنا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

شکر وتحسین

تقریر جناب حضرت مولانا محمد ناظم صاحب ندوی مدظلہٗ

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ عزیز دوست، قدیم رفیق، عالم جلیل اور اساتذۂ کرام اور عزیزو! آپ حضرات نے میرا جس طریقہ سے استقبال کیا اس کے متعلق میں یہ نہیں کہوں گا کہ خلاف توقع ہے بلکہ میں یہ کہوں کہ توقع سے بہت بلند وبالا استقبال اور اظہار مسرت کیا اور اس انداز میں آپ نے اپنی محبتوں سے نوازا، میرے دل میں ان کو ادا کرنے کے لئے جو جذبات ہیں اس کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں ۳۱ سال کے بعد آیا ہوں، اس میں شبہ نہیں کہ یہ بڑی لمبی مدت ہے لیکن جیسا کہ مولانا نے فرمایا کہ ۳۱ سال کی مدت میں اگر میں کہوں کہ ایک روز بھی میرا ذہن ندوہ سے فارغ نہیں رہا اور کسی کا ذکر نہ ہوا ہو، میں نے جو کچھ ندوہ میں ۳۱ سال کے بعد دیکھا ہے

وہ ترقی ظاہری اور باطنی ومعنوی ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ دور ندوہ کی تاریخ کا روشن ترین دور ہے، نہایت اعلیٰ درجہ کا تاریخ ساز دور ہے اور یہ ساری ترقی جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اگرچہ میں نے خواب میں بھی اسے دیکھا تھا، تصاویر میں اسے دیکھا تھا، تصاویر کو دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے شیر کی تصویر اور شیر کو دیکھے تو دونوں میں بڑا فرق ہے عمارت یا درسگاہ کی تصویر حقیقی ترقی کی نمائندگی نہیں کر سکتی ہے میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا یہ درحقیقت ایک شخص کے اخلاص کا مظہر ہے جس کے اخلاص سے اخلاص پیدا، جس کی دعاؤں سے لوگوں کے ذہن کے اندر دین سے محبت پیدا ہوئی، دینی درد پیدا ہوا اور جس نے اپنے سوز دروں سے اور اپنی دعاؤں سے اور اپنے اخلاص سے ندوہ کو وہ مقام عطا کیا جس کا تخیل بانیٔ ندوہ نے دیا تھا، اور جس تخیل پر بانیانِ ندوہ، مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا عبد الحی حسنی اور دوسرے بزرگوں نے اس کی بنیاد رکھی ان حضرات کے ذہن میں ندوہ صرف ایک درسگاہ نہیں تھا بلکہ درحقیقت ایک فکر کا نام ہے، ایک سنگم کا نام ہے جس کے اندر دریائے دنیا اور دریائے دین دونوں جمع ہوتے ہیں اس تصور کو، اس تخیل کو عملی طور پر صرف ایک شخص نے اپنے اخلاص سے، اپنے علم سے، اپنے تقویٰ سے، اپنی نیکی سے پیدا کیا اور جس طریقہ سے روشنی سے روشنی پیدا ہوتی ہے، چراغ سے چراغ جلتا ہے اسی طرح سے ایک مخلص کے اخلاص سے اخلاص پیدا ہوتا ہے دینداری سے دینداری پیدا ہوتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے میں نے تو کہا بھی کہ یہ دور حسنی ہے جیسے کہ میں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ ہمارے ندوی بھائیوں کا عربی زبان کا ایک اسلوب نگارش ہے ہم اس کو "الاسلوب الحسنی" سے تعبیر کرتے ہیں، اسی طریقہ سے اس دور کو دور حسنی کہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص سے وہ کام لیا جو ایک جماعت سے انجام پاتا ہے اور ایک شخص کے سوز دروں نے اور اس کے اخلاص نے ایک پوری جماعت پیدا کر دی ہے مجھے قطعاً اس کی توقع نہیں تھی کہ اتنی ترقی ہوئی ہوگی، اور اس طریقہ سے مسجد آباد ہوگی، گویا دبستان کھلا ہے بلبلیں چہک رہی ہیں اور جب صبح ہوتی ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی ہے، قرآن حفظ کیا جا رہا ہے۔ میں نے جو منظر ۳۱ سال کے بعد دیکھا اس کے نقوش میرے قلب پر پڑے ہیں اور میں اسے ساری زندگی نہیں بھول سکتا، طلبہ کی دینداری، ان کا باضابطہ نماز پڑھنا، اساتذۂ کرام کا ندوہ سے تعلق اور نہایت مستعدی اور محنت کے ساتھ پڑھنا اور پڑھانا اور سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ وہ اپنے مخلص کو، اپنے مربی کو اور اپنے مہربان کو اور اپنے عالم جلیل کو خوب جانتے ہیں پہچانتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں ان کے تمام مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ کسی ادارہ کو ایسا شخص مل جائے میں سمجھتا ہوں کہ امت محمدیہ پر یہ بڑا فضل ہے اس ہندوستان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد پیدا کئے جن کا دین سے ایسا تعلق ہے اور جن کے ارد گرد ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہیں اور جن کی باتوں کو سنتے ہیں ایک بات تو یہ تھی۔

دوستو! دوسری بات یہ کہ زبان سیکھنے کے لئے جب تک زبان سے محبت نہ ہو زبان نہیں آتی، اپنا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ مجھے لغت سے دلچسپی رہی میں اس کا انکار نہیں کر سکتا، ہزاروں الفاظ یاد کئے اس کا انکار نہیں کر سکتا، فقہ اللغۃ تقریباً زبانی یاد تھی، میں اس کا انکار نہیں کر سکتا، لیکن جو بات کہنی ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ میں نے ایک لفظ فقہ اللغۃ یا کسی دوسری کتاب میں پڑھا کہ دبے پاؤں چلنے کے لئے تاریقور آتا ہے پنجے کے بل چلنا جس میں آواز نہ ہو جیسے چور چلتے ہیں تو میں نے ایک مضمون ایسا لکھا جس میں چور کا ذکر تھا اور دبے پاؤں چلنے کا ذکر تھا۔ اسی طرح ہماری زبان کے اندر ایک لفظ کھنگالنا ہے آپ بھی جانتے ہونگے عربی میں ماص یموص موصاً کہتے ہیں اس کے معنی کھنگالنا کپڑے کو ہلکا دھونا ہے۔ تو کسی زبان سے اگر محبت ہوتی ہے تو ایک ایک لفظ کو انسان یاد کرتا ہے، اور اسے دل میں محفوظ رکھتا ہے اس کو استعمال کرتا ہے تب زبان آتی ہے۔ مجھے اتنی مسرت ہوتی تھی جب میں فقہ اللغۃ پڑھتا تھا، جیسے کہ اس زمانہ میں لوگوں کو جھوٹے عشق ومحبت کے افسانے پڑھنے سے ہوتی ہے۔ کہیں تو کوئی نیا لفظ ملنا چاہئے فقہ اللغۃ میں پڑھ لیا، المنجد میں دیکھ لیا، کسی اخبار میں پڑھ لیا،

میں نے بھی جدید عربی اخبارات ہی سے سیکھی ہے جدید عربی اخبارات ہی سے آتی ہے اور جب تک آپ اخبارات نہیں پڑھیں گے آپ جدید عربی جو کہ درحقیقت یورپ کی زبانوں کا ترجمہ ہے نہیں سیکھ سکتے، اور میں ایک بات اور کہتا ہوں کہ وہ تمام عالم دین جو انگریزی سے بالکل بے خبر ہیں وہ جدید عربی کے اخبارات کو تو سمجھ سکتے ہیں مگر اسے اپریشیٹ نہیں کر سکتے ہیں، یہ ترجمہ کس انگریزی اسلوب کا ہے، کسی زبان کا ہے، کس فکر کا ہے، میں اختصار سے کام لیتے ہوئے کہتا ہوں، زبان سیکھنے میں لغت کا بڑا دخل ہے ہمارے ہلالی صاحب (تقی الدین ہلالی مراکشی) کہا کرتے تھے کہ لغت کے بارے میں جتنا شک کروگے فائدہ پہونچے گا، ان کے الفاظ میں لغت کے معاملہ میں شک کرنا مفید ہے اس لئے آپ تحقیق کریں گے ممکن ہے کہ وہ لفظ اس طرح نہ ہو لیکن جب انسان لغت دیکھتا ہے تو اس کو ایک لفظ نہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ اس سلسلہ میں بیسیوں لفظ معلوم ہو جاتے ہیں اور ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک لفظ کی تحقیق وجستجو میں مثال بھی جان لیتے ہیں محاورہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کوئی شعر یاد ہو جاتا ہے۔

ہم اور مسعود عالم مرحوم دونوں کا طریقہ یہ تھا کہ بار بار ہم لغت کی طرف رجوع کرتے تھے اور تحقیق کرتے تھے، اس لئے میری یہ بھی نصیحت ہے جن کا عربی زبان سے تعلق ہے ادب سے تعلق ہے وہ مراجعہ ضرور کریں اور لغت بار بار دیکھیں، اس کے علاوہ ایک بات کی طرف خصوصیت سے آپ لوگوں کی توجہ دلاؤں گا کہ آجکل عالم عربی میں دو مضاف کے بعد مضاف الیہ لاتے ہیں اور بعض وقت تو دو تین، چار پانچ اور چھ کے بعد مضاف الیہ آیا ہے تو اس قسم کی ترکیب سے عربی زبان ناآشنا ہے، اس ترکیب کو کم از کم میں نے نہیں پڑھا۔ صرف ایک مثال دو مضاف کے بعد مضاف الیہ آیا ہے کہ ہے لیکن اب جو طریقہ آیا ہے اس سے عربی زبان عجیب وغریب زبان بن گئی ہے اور یہ چیز عام ہے آپ لوگ کم از کم اس سے احتراز کریں، اور آپ کا امتیاز ہو کہ آپ دو مضاف تین مضاف کے بعد مضاف الیہ نہ لگایا کریں۔

عزیزو! ندوہ کا اپنا ایک امتیاز ہے اس امتیاز کے اندر بغیر کسی تعصب کے ادارے سے آپ کو محبت ہونا چاہئے، تعلق ہونا چاہئے، آپ اپنے بزرگوں کا احترام کریں، اپنے اساتذہ کا احترام کریں، اور کسی دوسرے کا حق نہ ماریں کسی دوسرے کے خلاف تعصب نہ برتیں لیکن اپنے ادارے کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس ادارہ کے مقصد سے وابستہ رہیں، اس کے مقصد کو سمجھیں اور سمجھ کر اس کی اشاعت کریں، اپنے اساتذۂ کرام کی نصیحتوں کو غور سے سنیں، اساتذہ کی خدمت کریں۔ ہلالی صاحب کا حال یہ تھا کہ میں صبح وشام ان کے ساتھ رہتا، مہینوں ایسا ہوا ہے کہ میں نے انھیں خاص خاص وقتوں کے علاوہ چھوڑا نہیں، وہ جو لفظ بولتے تھے اس کو غور سے سنتا تھا، اور اس کو دُہراتا تھا، وہ ایک لفظ بولے اور میں اس کو دل میں دُہرا رہا ہوں، اور ان کی خدمت اس طرح انجام دیتا تھا کہ شاید کوئی ادنیٰ خادم بھی اس طرح سے نہ انجام دے، وہ مجھ سے بے حد محبت فرماتے تھے اور بڑے شفیق استاد تھے اور جب میں ان سے پہلی مرتبہ یہاں سے جانے کے بعد ۵۰ء کے حج میں ملا تو وہ اس طرح ملے محبت کے ساتھ کہ میں اندازہ نہیں کر سکتا ہوں کہ اپنے شاگرد سے ایسی ملاقات کی جاتی ہے اور اس طرح میرے ساتھ ساتھ چلے بعض کام کے سلسلہ میں کہ مجھے امید نہیں تھی، آپ نہایت وسیع القلب تھے۔ تو آپ بھی اگر اپنے اساتذہ کے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے تو آپ کو بھی اجر ملے گا، اور علم دین اپنے استاد کے ساتھ محبت کرنے، احترام کرنے اور خدمت کرنے سے ملتا ہے اور ہمارے مدارس عربیہ کی ایک خصوصیت ہے کہ اس کے اندر صرف درجہ کا تعلق نہیں ہوتا بلکہ درجہ کے باہر کا بھی تعلق ہوتا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کا تعلق اساتذہ سے صرف درجہ کا تعلق نہ ہو بلکہ

(بقیہ ص پر)

درجہ کے باہر کا بھی تعلق ہو۔

سب سے آخر میں ایک بات کہتا ہوں اور اس کو میں پاکستان میں بھی کہا کرتا تھا کہ کیا بات ہے کہ اسکول کے پڑھنے والے کو تو بہت رزق ملتا ہے اور مدرسہ کے پڑھنے والوں کو رزق نہیں ملتا اس لئے کہ مدرسہ کے پڑھنے والوں نے اپنے متعلق یہ رائے قائم کر لی ہے کہ ہم کو یہی ملنا چاہیئے اس لئے کم ملتا ہے اور اگر یقین کر لیں کہ ہم کو وہ ملے گا جو ہم چاہیں گے تو وہی ملے گا اور اللہ تعالیٰ وہی سلوک کرتا ہے جیسا آپ حسن ظن دلا سکتے ہیں انا عند ظن عبدی بی، اور میں طلبہ کو نصیحت کرتا تھا کہ تم یہاں سے نکل رہے ہو تو تم اپنے کو حقیر مت سمجھنا اپنے آپ کو ذلیل مت سمجھنا، تم مت سمجھنا کہ تم نے علم دین حاصل کیا تو تم چھوٹے ہو گئے اور تمہارے لئے دنیا تنگ ہو گئی، اللہ تعالیٰ کافروں کو دیتا ہے، اللہ تعالیٰ مشرکوں کو دیتا ہے، اللہ تعالیٰ جاہلوں کو دیتا ہے تو تم کو وسیع رزق نہیں دے گا تم کو بھی خوب وسیع رزق دے گا، اس لئے میری یہ آخری نصیحت ہے کہ آپ اپنے اللہ کے متعلق حسن ظن رکھیں کہ آپ کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جیسا کہ آپ اس کے ساتھ یقین رکھیں گے۔ میں ہندوستان سے واپس پاکستان جا رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ نقوش تاحیات باقی رہیں گے اور اللہ کو منظور ہوا تو ہماری بار بار ملاقات ہوگی انشاء اللہ۔

ان الفاظ پر میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور آپ تمام حضرات، خصوصاً اپنے قدیم رفیق اور قدیم دوست کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

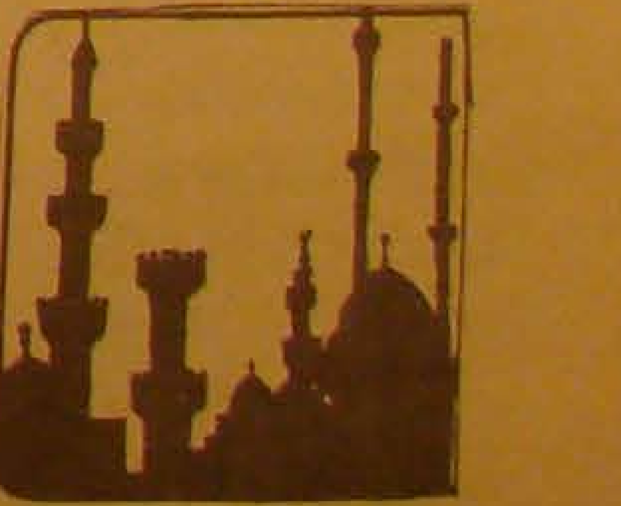

آپ حضرات کے علم میں ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء، عالم اسلام کا ایک بڑا علمی و دینی مرکز ہے جو حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی سرپرستی میں بفضلہ تعالیٰ اہم دینی و علمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک، افریقہ، ملیشیا، تھائی لینڈ، یوگنڈہ، عمان، انڈونیشیا، تبت وغیرہ کے طلبہ بھی زیر تعلیم ہیں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی خوبصورت و عالیشان مسجد ابھی چند سال قبل توسیع کے مرحلہ سے گذر چکی ہے، جس میں اہل خیر حضرات نے دل کھول کر حصہ لیا تھا لیکن چند ہی برسوں میں طلبہ کی تعداد بڑھ جانے نیز جمعہ و عیدین میں قرب و جوار کے نمازیوں کی آمد کے سبب مسجد پھر بہت تنگ ہونے لگی، اکثر شامیانہ لگانا پڑتا ہے، باہر سے آئے ہوئے معزز مہمانوں نے بھی اس تنگی کو محسوس کر کے توسیع کی طرف متوجہ کیا مگر اس ہوش ربا گرانی کے زمانہ میں اتنے بڑے کام کا شروع کرنا آسان نہ تھا تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے بھروسہ پر بروز جمعہ ۹ رجب ۱۴۰۱ھ مطابق ۸ مئی ۱۹۸۱ء بوقت اشراق حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی دامت برکاتہم کے ہاتھوں اس مبارک کام کا آغاز کر دیا گیا، اللہ کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ اپنے گھر کی توسیع کے مراحل آسان فرمائے گا، موجودہ گرانی کے دور میں یقیناً یہ ایک اہم اور بڑا کام ہے، جس کے مصارف کا تخمینہ پانچ لاکھ سے کچھ زائد ہے۔

زیر تعمیر اضافہ انشاء اللہ تین منزلہ ہوگا اور مسجد کے مسقف حصہ کے بقدر انشاء اللہ توسیع ہو کر نمازیوں کے لئے دوگنی گنجائش نکل آئے گی۔

دار العلوم کی مسجد کی تعمیر عام مسلمانوں کے تعاون سے ہی ہوئی تھی جس میں خواتین نے بھی ہمت اور حوصلہ سے حصہ لیا تھا، امید ہے کہ اہل خیر حضرات اس مبارک کام میں فراخدلی کے ساتھ حصہ لیں گے۔

"مَنْ بَنیٰ لِلّٰہِ مَسْجِدًا بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ"

ترجمہ: جس نے اللہ (کی عبادت) کے لیے مسجد بنائی اللہ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

(مولانا) محب اللہ صاحب ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	(مولانا) معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء	(جناب) مصباح الدین صاحب معتمد مال

نوٹ: منی آرڈر، چک اور ڈرافٹ بھیجنے کا پتہ: ناظم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳، ندوہ۔ لکھنؤ۔

باعث خیر و برکت نکاح

الحاج عبدالکریم پاریکھ ناگپور،

کامیاب نکاح وہ ہے جہاں حدود شریعت کو پامال نہ کیا گیا ہو خوشی خوشی سب کام پوری سادگی سے انجام پائے، دلہن گھر آئی، اس کے ماں باپ پر ملک سے متعلق کوئی اعتراض نہ ہوا، ہنسی خوشی ہر چھوٹے بڑے نے نئی دلہن کا استقبال کیا۔ آنے والی نے اپنی ساس اور خسر کو ماں باپ کی جگہ کیا شوہر کو اپنا سرتاج مانا۔

دوسری طرف دولہانے اس دلہن کو پاکر اپنا بقیہ آدھا ایمان پورا کر لیا، رشتۂ حیات سے منسلک اس شریک حیات کا شوہر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگ گیا، دلہن نے نند اور دیور کو اپنا بہن بھائی مانا، گھر کے کام کاج کو اپنے سر لیا، اگر کم آمدنی والا گھرانہ ہے تو دھوبی اور درزی کے گھر جانے والی رقم کو روک لیا، گھریلو اخراجات میں اصلاح اور کفایت شعاری سے بچت بھی اچھی خاصی کر لی،

پھر ایک مسلم عورت اپنے فرائض کی ادائیگی میں، نماز و تلاوت قرآن مجید سے خدا کی برکت کا ظہور ہونے کا سبب بنی۔

دلہن آتے ہی گھر میں نہایت ہی سلیقہ سے رکھ رکھاؤ قائم کر دیا، میاں جب گھر آئے مسکرا کر ان کا استقبال کیا، ہر طرح کی زینت و آرائش صرف اپنے شوہر کے لئے روا رکھے، تاکہ شوہر کو دنیا میں صرف اپنی دلہن ہی خوبصورت و خوب سیرت معلوم ہو۔ اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں وہ سلیقہ کہ محلہ پڑوس میں گھر کے بچے مثالی بچے کہے جانے لگیں۔

شوہر کے گھر آنے پر کوئی شکوہ شکایت۔ اس کی ماں بہن کی مطلق نہیں، محلہ پڑوس میں کسی سے بھی لڑائی جھگڑا نہیں کیا، نئے ماں باپ اور نئے بھائی بہن اس دلہن پر ایسے فدا کہ میکہ چلی جائے تو نیا گھر سونا، اور سسرال آجائے تو پرانے گھر کے لوگ دیدار کو ترس جائیں۔

اچھا گھر وہ ہے جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی کام میں مصروف ہو یا پھر کوئی تلاوت کر رہا ہو، کوئی اچھی کتابیں پڑھتا یہ سب کام میاں بیوی اور گھر کے سارے لوگ ایک دوسرے کے تعاون سے جاری رکھے ہوئے ہوں۔ نیا گھر بسا کر دوسرے رشتہ داروں سے نبھاؤ اور بناؤ کو وسیع پیمانے پر قائم کر دیا گیا ہو، خیر خیرات، اجر آخرت اور رضائے الٰہی کی نیت سے جاری ہوں، مسکینوں کو کھانے کھلائے جائیں، گو غربت ہو تنگ دستی ہو تو سالن میں کچھ پانی زیادہ ڈال دیں، مگر راہ خدا میں کچھ نہ کچھ اس کے غریب اور بے سہارا لوگوں کو دیے جائیں۔ توبہ اور استغفار انابت الی اللہ، یہ سب کام ہوں تو چغلی و غیبت کا موقعہ ہی نہ آئے، گھر کو شمع نبوت سے ایسا روشن کر دیا جائے کہ اندھیاریاں لاپتہ ہوں۔ یہ تمام باتیں نکاح کی کامیابی کا ثبوت ہیں۔

ایک اچھے خاندان کی بہترین خوبی یہ ہے کہ افراد کا باہمی ربط و ضبط ہو، گھر کے افراد کے درمیان محبت و چاہت ہو، ایک دوسرے کے دمساز ہوں، کوئی بھی سنگ دلی کا مظاہرہ نہ کرے، نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔

دین حنیف اپنے ماننے والوں کو بنیان مرصوص دیکھنا چاہتا ہے یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار، اس مضبوط دیوار کا سنگ بنیاد وہ خاندان ہے جو عورت مرد باہم مل کر وجود میں لے آتے ہیں۔ خاندان کی اساس عورت مرد کے تعلقات خراب ہونے سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ ابلیس لعین کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی کہ میاں بیوی میں رنجش پیدا کر دے، اور بس باقی تمام کام آخری مرحلہ پر میاں بیوی خود ہی کر ڈالتے ہیں، لیکن کامیاب نکاح والے گھر کے افراد ابلیس کو اس محاذ پر بھی دفن کر کے رہتے ہیں۔

ایسی کامیاب گھریلو زندگی کا نسخہ خود قرآن پاک میں رب اعلیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

" واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام "

اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے نام پر سوال کرتے ہو، اور قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے بچتے رہا کرو۔

رشتہ قرابت میں آدمی کے لئے پورا آدمی بن جانے کے بعد اس کی بیوی بڑا اہم مقام رکھتی ہے، آدمی کو چاہیے کہ ہر طرح اپنی زوجہ کا بلحاظ دین اور دنیا کی مسرتوں کا پورا خیال رکھے۔ حدیث شریف میں اچھا آدمی اسی کو کہا گیا ہے جو اپنے اہل وعیال کے لئے خیر ہی خیر ہو،

شوہر کے لئے ضروری ہے کہ اپنی بیوی کی زینت و آرائش کا زیور خود ہی بن کر دکھائے، اس کی دلچسپی میں تعاون کرے، گھریلو کام میں جتنا بن سکے تعاون کرے، بیوی کو نوکر چاکر کی طرح نہیں بلکہ گھر کی مالکہ اور خود اپنا آدھا ایمان تسلیم کرے۔

گھر میں رہتے وقت خود بھی اپنے آپ کو اچھے لباس میں بیوی کی توجہ کا مرکز بنا دے، جو لوگ باہر تو خوب بن سنور کر جاتے ہیں اور گھر پر پھٹی لنگیاں اور میلی بنیان پہن کر رہتے ہیں۔ انھیں کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے اپنے لباس کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ بیوی جب باہر جائے تو بہترین لباس میں جائے۔ اور گھر میں سر جھاڑ، منہ پھاڑ بیٹھی ہو، ایسی دلہن کامیاب نکاح کا لطف حاصل نہیں کر سکتی، اسی طرح جو بھائی اپنے دوست احباب میں خوب بن سنور کر جائے اور گھر میں اپنی زوجہ کی کشش سے لاپرواہ ہو، وہ بھی اس مسرت سے محروم رہے گا۔

بازار، سینما اور نمائش میں دکھنے والی عورتیں اور مرد اپنی زینت و کشش میں بازاری حد تک آرائش کرتے ہیں۔ گھریلو زندگی والے جب ان دائروں میں اپنے جوڑے کا تصور کرتے ہیں تو انھیں بڑی مایوسی ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ ہم گھریلو فضا کو نہایت صاف ستھری اور پاکیزہ رکھیں، پھر دیکھئے بازار کی زینت اور گھر کی زینت کا مقابلہ ہو تو سکون قلبی انشاء اللہ ہر مومن کے گھر میں ہوگا۔

حقیقی کشش طہارت، پاکیزگی، ستھرائی اور سلیقہ مندی میں پائی جاتی ہے۔ ملت کے بھائی بہنوں کا خیال اسی طرف آئے تو انشاء اللہ گھر کو جنت بناتے دیر نہیں لگے گی۔

نعت

از پروفیسر محمد جلال جلال گڑھپوری ایم۔ اے

وہ پچھلے پہر اشکوں کی برسات کا عالم
محویت اذکار و عبادات کا عالم
معراج کی شب حق سے ملاقات کا عالم
خلوت میں حرا کی تھا حجابات کا عالم
فیضان محمدؐ سے تھا یہ حال صحابہؓ
رفتار میں گفتار میں کردار میں ہر دم
مکہ کی وہ تسخیر تھی یا سیل کرم تھا
غلظت کا یہ عالم کہ تھے مجبور بہ ہجرت

محبوب دو عالم کی مناجات کا عالم
وہ قربت خلاق سماوات کا عالم
بشریت عظمیٰ کے کمالات کا عالم
غزوات کا عالم تھا فتوحات کا عالم
ہر جیسے کہ خورشید سے ذرات کا عالم
تھا پیش نظر یوم مکافات کا عالم
یا رحمت عالمؐ کی عنایات کا عالم
کثرت کا یہ منظر کہ تھا عرفات کا عالم

دربار الٰہی میں جلال اتنی دعا ہے
ایمان کی حالت میں ہو سکرات کا عالم

محمد نور الحق رحمانی

ردِّ قادیانیت کے سلسلہ میں

بانیٔ ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری علیہ الرحمۃ کی خدمات

قادیانیت کیا ہے؟

قادیانیت ایک مرتد خیال اور مضل جماعت ہے۔ وہ شریعت محمدی کے خلاف بغاوت اور ایک متوازی دین کی دعوت ہے۔ اس کی بنیاد عقیدۂ ختم نبوت کے انکار، انبیاء علیہم السلام کی توہین دین اسلام کے بنیادی ارکان حج اور جہاد کے ابطال اور امت کے مسلمہ اصول و عقائد سے انحراف پر ہے۔

یہ فتنہ پہلی مرتبہ انیسویں صدی عیسوی کے اخیر میں برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں ظاہر ہوا۔ انگریز ان دنوں ہندوستان میں اپنا قدم جمانے اور سیاسی تسلط قائم کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کا جذبۂ جہاد اور باہمی اتحاد اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا ان کی صف میں دینی اور فکری طور پر انتشار پیدا کرنا، ان کی جمعیت کو پارہ پارہ کرنا، ان کی طاقت کو کمزور کرنا سیاسی نقطۂ نظر سے حکومت چلانے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہمارا حسین خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اس کام کے لئے انھیں مرزا غلام احمد قادیانی کی شخصیت نہایت مناسب اور موزوں نظر آئی، جس کی دلی تمنا تھی کہ کسی ممتاز اور اونچے عہدہ پر فائز ہوں۔ ان کے کچھ متبع اور پیروکار ہوں۔ وہ دینی رہنمائی کے منصب پر پہونچ کر پورے عالم اسلامی پر چھا جائیں اور تاریخ میں ان کا نام جلی حرفوں میں لکھا جائے۔ اس طرح انگریز کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے بڑا اچھا فرد ہاتھ آ گیا، چنانچہ یہ تحریک دین کے نام پر انگریزی سامراج اور برطانوی حکومت کی زیر سرپرستی وجود میں آئی اور اسلام کے خلاف اس نے اپنی سرگرمی شروع کر دی۔ ادھر انگریز، حکومت برطانیہ اور دوسری اسلام دشمن جماعتوں اور تحریکوں نے اس کی بھرپور حمایت اور ہمت افزائی کی اور اس تحریک کو تیز سے تیز تر کرنے کے لئے تمام ضروری اسباب و وسائل اور مادی سہولتیں بہم پہونچائیں۔

حالات کی نزاکت اور علماء کرام کی فرض شناسی

مسلمانان ہند کے لئے یہ دور دینی نقطۂ نظر سے نہایت پرفتن اور پرآشوب تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اس ملک میں اسلام اور مسیحیت کی کشمکش پورے شباب پر تھی، عیسائی مشنریاں ملک کے طول و عرض میں پھیل کر مالی امداد اور دوسرے وسائل کے ذریعہ ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً عیسائی بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اس کے لئے ہر قسم کے موثر وسائل و ذرائع استعمال کر رہی تھیں۔ علماء کرام ایک طرف اس فتنہ کا مقابلہ کر رہے تھے، اور قرآن و اسلام کے خلاف ان کے عائد کئے گئے غلط الزامات کا جواب دے رہے تھے کہ اچانک یہ دوسرا فتنہ پہلے سے زیادہ ہولناکیوں کے ساتھ نہایت خطرناک صورت میں رونما ہوا۔ مگر علماء اسلام اور مجاہدین ملت جنھوں نے تاریخ کے ہر دور میں اور زندگی کے ہر موڑ پر آنے والے خطرات کو اپنی ایمانی فراست اور روحانی بصیرت سے محسوس کیا اور انھیں فرو کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے، انھوں نے اس فتنے کی نزاکت اور شدت کا ادراک کیا اور اس کی سرکوبی کے لئے سینہ سپر ہو کر میدان میں آ گئے۔ اس میدان میں جو علماء کرام پیش پیش تھے، ان میں قطب العالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرفہرست ہے۔

مولانا مونگیریؒ اور ان کے کارنامے

مولانا مونگیریؒ جن کی علمی یادگار "ندوۃ العلماء لکھنؤ" اور "جامعہ رحمانی مونگیر" کی صورت میں موجود ہے، جو تمام عالم اسلام میں مقبول و متعارف ہے۔ اور علم و دین کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ جنکی روحانی یادگار "خانقاہ رحمانی" کی شکل میں آج بھی قلوب و نفوس کو گرما رہی ہے اور ہزاروں تشنگان علم و معرفت اس سے وابستہ ہو کر اپنے باطن کی اصلاح و تعمیر کر رہے ہیں۔ جن کے کارنامے ردِ عیسائیت میں زندہ و تابندہ نقوش اور انمٹ یادگار ہیں اور دسیوں کتابیں عیسائی عقائد کے رد و ابطال میں موجود ہیں اور اس موضوع پر اصلاحی و تجدیدی کارنامے کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اس فتنہ قادیانیت کے مقابلے کے لئے پورے عزم و حوصلے کے ساتھ میدان میں آ گئے اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اس راہ میں وقف کر دیں۔

مونگیر میں اقامت اور اصلاحی خدمات

صوبہ بہار اس وقت سب سے زیادہ اس فتنے کی زد میں تھا، مونگیر اور بھاگلپور کے متعلق تو یہ گمان ہو چلا تھا کہ شاید یہ دونوں ضلعے مکمل طور پر قادیانی ہو جائیں گے۔ قادیانی مبلغین برق رفتاری کے ساتھ اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے اور طرح طرح کے پمفلٹ اور لٹریچر عام مسلمانوں میں تقسیم کر رہے تھے اور سیدھے سادے مسلمان انہیں پڑھ کر متاثر ہو رہے تھے۔ اس بنا پر ضروری تھا کہ آپ بہار میں اقامت اختیار کریں۔ چنانچہ آپ اپنے مرشد اور شیخ طریقت قطب العالم حضرت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی کے ایماء پر تشریف لے آئے اور یہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اس شہر کو اپنی اصلاحی تحریک کا مرکز بنایا۔ "خانقاہ رحمانی" کے نام پر یہاں ایک خانقاہ قائم کی جس سے خلق خدا کی رہنمائی، تزکیۂ قلب، اصلاح باطن، اخلاقی و روحانی تربیت، رد بدعت اور عقائد صحیحہ کی ترویج و اشاعت کا اہم ترین فریضہ انجام پایا۔ اور الحمد للہ آج بھی یہ خانقاہ مرکز رشد و ہدایت اور مرجع عوام و خواص ہے۔

قادیانیت کے خلاف ایک منظم تحریک کا آغاز

آپ نے اس فتنہ کے خلاف ایک منظم تحریک شروع کی اور اس کی بیخ کنی کے لئے اپنے تمام تر اوقات وقف کر دئے، اپنے خلفاء مریدین اور متعلقین کو خاص طور پر اس کی جانب متوجہ کیا اور اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی ترغیب دی۔ اس کام کو آپ نے وقت کا افضل ترین جہاد قرار دیا اور خطوط و رسائل، تصنیف و تالیف، تبلیغی اسفار، اجتماعات، عوامی جلسوں اور مناظروں کے ذریعہ قادیانی عقیدے کا بطلان اور اس کی نامعقولیت قرآن و سنت، اجماع امت اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں ظاہر کی، اور مرزا صاحب کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں، ان کے جھوٹے دعوؤں، غلط پروپگنڈوں افترا پردازیوں اور جھوٹی پیشین گوئیوں کا اچھی طرح جائزہ لیا، اور ان کا کذب محض ہونا واضح کیا۔

ایک تاریخی مناظرہ اور قادیانیوں کی شرمناک شکست

سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک اہم اور تاریخی مناظرہ مونگیر میں ہوا، جس میں قادیانیوں کو ذلت آمیز اور شرمناک شکست ہوئی، جو اس فتنے کے لئے ضرب کاری ثابت ہوا۔ حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اس مناظرہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"مرزا صاحب کے نمائندے حکیم نور الدین صاحب، سرور صاحب اور

روشن علی صاحب، مرزا صاحب کی تحریر لے کر آئے کہ ان کی شکست میری شکست ہے، اور ان کی فتح میری فتح۔ اس طرف سے مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الوہاب بہاری، مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹیؒ (تقریباً چالیس علماء) بلائے گئے تھے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ عجیب منظر تھا۔ صوبہ بہار کے اضلاع کے لوگ تماشائی بن کر آئے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ خانقاہ میں علماء کی ایک بڑی بارات ٹھہری ہوئی ہے۔ کتابیں الٹی جا رہی ہیں۔ حوالے تلاش کئے جا رہے ہیں، اور بحثیں چل رہی ہیں، سوال یہ پیدا ہوا کہ مولانا محمد علی کی طرف سے مناظرہ کا وکیل اور نمائندہ کون ہو؟ قرعۂ فال مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے نام پڑا۔ آپ نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو تحریراً اپنا نمائندہ بنایا۔ علماء کی یہ جماعت میدان مناظرہ میں گئی، وقت مقرر آگیا۔ ادھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ اسٹیج پر تقریر کے لئے آئے اور آپ سجدے میں پڑ گئے، اور اس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک فتح کی خبر نہ آگئی۔ بوڑھوں کا کہنا ہے کہ میدان مناظرہ کا عجیب منظر تھا۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ کی ایک ہی تقریر کے بعد جب قادیانیوں سے جواب کا مطالبہ کیا گیا تو مرزا صاحب کے نمائندے جواب دینے کے بجائے انتہائی بدحواسی اور گھبراہٹ میں کرسیاں اپنے سروں پر لئے ہوئے یہ کہتے بھاگے کہ ہم جواب نہیں دے سکتے۔"

اس مناظرہ میں انہیں ایسی بدترین شکست ہوئی اور ایسی ذلت اٹھانی پڑی کہ پھر دوبارہ وہ اس میدان میں آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس مناظرہ سے اس تحریک کو پورے ملک میں شدید نقصان پہونچا، اور اس کی سرگرمیوں میں کسی حد تک کمی آگئی۔ اور اس کے بڑے مفید اور خوشگوار نتائج ظاہر ہوئے۔

مولانا کے تصنیفی کارنامے

اس مناظرہ کے بعد مولانا نے اس فتنے کے خلاف دوسرے موثر ذرائع و وسائل اختیار کئے، اہم مقامات کا سفر کیا، متعلقین و متوسلین اور دوسرے اہم لوگوں کے نام خطوط لکھے، خصوصاً تصنیف و تالیف کا کام بڑے اونچے پیمانے پر شروع کیا اور اسی مقصد کے تحت ایک مستقل پریس خانقاہ میں قائم کیا، جو صرف قادیانیت کے رد میں لکھی جانے والی کتابوں کی اشاعت کے لئے وقف تھا اب آپ نے اپنے اکثر اوقات کو تصنیفی کاموں کے لئے فارغ کر لیا، حتیٰ کہ تہجد کے اوقات بھی اب اسی کام کے لئے وقف تھے، صرف آپ نے اس فتنے کے رد میں چھوٹی بڑی تقریباً سو کتابیں تصنیف فرمائیں، اور یہ سب اکثر ضعف علالت کی حالت میں اسے فضل خداوندی اور تائید غیبی کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، چنانچہ آپ اپنے ایک خاص خادم کے خط میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میرا ضعف و ناتوانی۔ اے عزیز! تم پر اور تمہارے کل سلسلہ کے بھائیوں پر ظاہر ہے کہ میں مدت سے بیکار ہو چکا ہوں، اور میرے ظاہری قویٰ نے جواب دے دیا ہے، مگر خدائی ارشاد "انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون" نے اپنی غیر محدود قدرت کا ایک ضعیف و ناتواں ہستی میں جلوہ گر فرما کر وہ کام لیا، جس کا خیال و خطرہ بھی نہ تھا، اس قدر رسائل اس ضعف و ناتوانی میں لکھوا دینا اس کا فضل ہے۔"

اور یہ واضح رہے کہ اس سلسلے کے تمام اخراجات مولانا اپنی طرف سے ادا کرتے اکثر ایسا ہوتا کہ اپنی اہم ضرورتوں کو روک کر پہلے کتابوں کی اشاعت کا انتظام کرتے اور جس قدر رقم آپ کے پاس موجود ہوتی وہ سب اس پر صرف کر دیتے اور ان کتابوں کو زیادہ تر مسلمانوں کے درمیان مفت تقسیم کراتے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے مستفید ہو سکیں، یہ سب خدا اور رسول کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور تعلق کا نتیجہ تھا، آپ کی اسلامی غیرت و حمیت نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ "مرزا غلام احمد" کی گستاخی اور توہین کو گوارا نہ کیا، اور اسے مٹانے کے لئے بےچین و بےقرار ہو گئے، چنانچہ ہر کام سے نظر پھیر کر انھوں نے اس فتنے کے خاتمہ کا تہیہ کر لیا، آپ نے اپنے خلفاء اور مسترشدین کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ:

"اتنا لکھو اور اس قدر طبع کراؤ اور اس طرح تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اٹھے تو اپنے سرہانے میں رد قادیانیت کی کتاب پائے۔"

مولانا کی تصنیفات کا اثر

مولانا کی یہ کتابیں نہ صرف ملک کے گوشہ گوشہ تک پہونچیں بلکہ بیرون ملک برما سے لے کر افریقہ تک جہاں قادیانیت کی ترویج و اشاعت ہو رہی تھی پہونچ کر تریاق کا کام کیا اور ناواقف مسلمان جو کسی طرح اس سے متاثر ہو رہے تھے وہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر اس سے تائب ہو گئے اور اس طرح قادیانیت کے جمتے ہوئے قدم اکھڑ گئے۔ لاکھوں انسانوں نے مولانا کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا، اور ارتداد کے طوفان سے اپنے کو بچا لیا، مولانا کی تحریروں کی اہمیت اور تاثیر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر قادیانی مبلغوں کو یہ معلوم ہوتا کہ یہاں مولانا کی کتابیں پہنچ چکی ہیں یا ان کی اشاعت ہو رہی ہے تو وہاں سے بھاگ جاتے اور جب اس دوسری جگہ مولانا کی تحریریں ان کا پیچھا کرتیں تو اسے چھوڑ کر کسی اور جگہ کی پناہ لیتے۔ خلاصہ یہ کہ اس فتنے نے جہاں سر اٹھایا اور جہاں کہیں اس کی تبلیغ ہوئی مولانا کی کتابوں نے وہاں پہونچ کر اس کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کو دور کیا اور ہزاروں انسانوں کو غلط فہمی سے بچایا۔ مولانا کا یہ کارنامہ اور جہاد بالقلم اس امت پر اتنا بڑا احسان ہے کہ پوری ملت اسلامیہ اس بار سے سبکدوش نہیں ہو سکتی اور آپ کی پاکیزہ زندگی کا یہ وہ روشن باب ہے، جس کے ذکر کے بغیر اسلامی ہند کی دینی تاریخ ناقص رہے گی۔ آپ نے اپنی بصیرت ایمانی سے لاکھوں انسانوں کو کفر و ارتداد کے سیلاب سے بچا لیا۔

ردِ قادیانیت پر مولانا کی مشہور کتابیں اور انکی اہم خصوصیات

اس موضوع پر مولانا کی مشہور تصنیفات یہ ہیں: فیصلۂ آسمانی، شہادت آسمانی (تین جلدیں)، چیلنج محمدیہ، معیار صداقت، معیار المسیح، تنزیہ ربانی، نامۂ حقانی، آئینۂ کمالات مرزا، مرزائی نبوت کا خاتمہ، عبرت خیز وغیرہ ——— یہ کتابیں اپنی بہت سی خصوصیات کی بنا پر اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں، خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ سادہ دلنشیں اور موثر اسلوب بیان، محکم طرز استدلال، عام فہم تعبیرات ہر قسم کی پیچیدگیوں سے خالی، دلائل کی قوت، مستند تاریخی حوالے، آیات قرآنیہ اور نصوص قطعیہ سے اس پر استشہاد وغیرہ یہ وہ خوبیاں ہیں جو مولانا کی ان کتابوں میں پوری طرح نکھر کر سامنے آئی ہیں اور جن کا اعتراف تمام اہل علم نے کیا ہے۔

فیصلۂ آسمانی کے بارے میں حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ تحریر فرماتے ہیں:-

"قادیانیت کے رد میں لکھی ہوئی اکثر کتابوں میں بعض بعض جگہ احتمال کی گنجائش نکل آتی ہے، مگر اس کتاب میں کسی جگہ احتمال کی گنجائش یا استدلال میں کوئی خامی اور کمزوری نہیں آتی۔ مولانا کے جذبۂ اخلاص، سوز دروں اور حسن نیت نے ان کی اہمیت و افادیت اور قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔"

یہ کتابیں مولانا کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی بارہا شائع ہوئیں، لیکن مرزا صاحب یا ان کے حواریین میں سے کسی نے ان کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی، ان میں سے بعض کتابیں اردو، فارسی اور انگریزی تینوں ہی زبانوں میں شائع ہو کر مقبول عام ہوئیں اور خلق خدا کی ہدایت کا سبب بنیں، مرزا صاحب نہ صرف نبوت کے مدعی تھے بلکہ وہ اپنے آپ کو امام مہدی اور مسیح موعود بھی کہتے تھے، یہ دعوے جس قدر متضاد اور باہم متعارض

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

مکتوب قاہرہ

صدر سادات......؟

ابو ذکی انور

"صفحات من تجربتی" ایک تازہ کتاب شائع ہوئی ہے اس نے یہاں خاصا ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ اس میں ناصر اور ان کے دور پر سخت تنقید ہے اور اس سلسلہ میں بعض متعین واقعات کا بھی تذکرہ ہے، اور کتاب کے مصنف مہندس عثمان احمد عثمان صدر سادات کے بہت گہرے دوست ہیں کئی بار وزارت میں شامل ہو چکے ہیں اور متعدد ترقیاتی اور تعمیری پروجکٹوں کے ذمہ دار بھی ہیں اور سادات کے سمدھی بھی ہیں۔ سادات کی ایک لڑکی کی شادی عثمان کے لڑکے کے ساتھ ہوئی ہے۔ انھیں اسباب سے لوگوں میں افواہیں پھیلیں کہ اس کتاب کی ترویج اور ناصر پر کیچڑ اچھالنے میں سادات کا اشارہ ہے۔ یہ بات یہاں تک پھیلی کہ سادات کو بیان دینا پڑا کہ چھپنے سے پہلے انھوں نے یہ کتاب نہیں دیکھی تھی اور ان لوگوں پر سخت تنقید کی جو ناصریت کے دعویدار ہیں اور ناصر اور ان کے ورثاء سے ہمدردی کے دعوے کرتے پھرتے رہتے ہیں انھوں نے اپنا یہ جملہ بھی دہرایا کہ ناصر کے دور میں جو کچھ بھی ہوا میں برابر کا شریک ہوں! اور ان کی اولاد مجھے اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہے اور ان پر کیچڑ اچھالنا برداشت نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ کتاب میں مذکورہ واقعات کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی لیکن اس کا دائرہ کار صرف ناصر کے دور تک محدود کر دیا گیا حالانکہ کتاب میں اس کے بعد کے واقعات بھی مذکور اور ان پر تنقید ہے، اس کے جواب میں یہاں کے اخبارات میں سخت لہجہ میں مراسلے بھی چھپے اور بہت سے لوگوں نے مخالف و موافق تبصرے کئے، ان میں ناصر کے داماد اشرف مروان، سابق وزیر اعظم عبد العزیز حجازی اور سابق وزیر دفاع حسین فوزی کے مراسلے تھے، ان میں عبد العزیز حجازی کا مراسلہ تو بہت ہی سخت تھا۔ بہرحال یہ واقعات کمیٹی میں زیر بحث نہیں آئے اور جو واقعات زیر بحث آئے

ان کے بارے میں صاحب کتاب نے یہ کہکر دامن چھڑا لیا کہ میں نے کسی متعین شخص پر الزامات نہیں لگائے ہیں اور نہ ہی کسی کی اہانت مقصود ہے اور کمیٹی نے اسی کو کافی سمجھتے ہوئے انھیں بری قرار دیدیا، اور دلچسپ بحث مجلس شعب میں کمیٹی کی رپورٹ پر ہوئی۔ اس میں صاحب کتاب کے موقف اور کمیٹی کے فیصلہ دونوں کا مذاق اڑایا گیا۔ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن عثمان احمد عثمان کو وزارۃ التنمیۃ والتعمیر سے استعفا دینا پڑا۔ اور عثمان احمد نے سادات سے کہا کہ آپ کو میری کتاب سے تکلیف پہونچی ہے؟ سادات نے کہا ہاں! میں تمام معاملات میں عبد الناصر کا پورا پورا شریک ہوں اور مجھے منظور نہیں کہ ان پر تنقید ہو اور ان کی اولاد کو تکلیف پہونچائی جائے تو عثمان نے معذرت کی کہ آپ کو تکلیف پہونچی اس کا مجھے سخت افسوس ہے یہ بات سادات نے خود بیان کی۔ بہرحال کتاب اب بھی بک رہی ہے اس کے لئے اعلانات بھی شائع ہو رہے ہیں اور اس میں ناصر پر سخت تنقید کا حصہ سادات کی پارٹی کے ہفت روزہ "مایو" میں بہت نمایاں طور پر شائع ہوا۔ اور عثمان صاحب نے وزارت سے تو استعفا دیدیا جو فوراً ہی منظور بھی ہو گیا۔ لیکن وہ اب بھی برسر اقتدار پارٹی میں "لجنۃ التنمیۃ القومیۃ" کے سربراہ اور کئی پروجکٹوں کے واحد ذمہ دار ہیں، اور ٹھیکہ دار بھی، ان کے استعفا کے چند ہی روز بعد وزیر تعدیل ابو سمکی نے بھی استعفا دے دیا، یہ عثمان احمد کے خاص آدمی سمجھے جاتے تھے اور کسی زمانہ میں ان کی کمپنی "المقاولون العرب" کے مشیر قانونی بھی رہ چکے تھے۔ کچھ لوگوں نے انکے استعفا کے اسباب کا مطالبہ کیا۔ لیکن کوئی جواب نہیں۔

اس کتاب پر ہنگامہ بہت سی باتوں کے ابھرنے کا بہانہ بن گیا۔ اور موجودہ نظام کی پالیسیوں پر سخت تنقید شروع ہو گئیں۔ داخلی سیاست پر بھی اور خارجی میں سب سے زیادہ اور سخت تنقیدیں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ اور عرب دنیا سے انقطاع پر ہو رہی ہے۔ ماہنامہ "الدعوۃ" ماہنامہ "الاعتصام" والے تو شروع ہی سے واضح ہیں لیکن اب اُن لوگوں نے بھی تنقید شروع کر دی ہے، جنھوں نے شروع میں ساتھ دیا تھا یا کسی وجہ سے خاموش رہے تھے لیکن اب یہ تنقیدیں نجی مجلسوں یا محدود اجتماعات سے آگے بڑھ کر اخبارات میں آ رہی ہیں اور حزب مخالف کا ہفت روزہ "البعث" بہت واضح ہو گیا ہے۔ ابھی گذشتہ شمارہ میں تو یہاں تک بات لکھ دی ہے کہ سادات اپنی لامحدود مقبولیت کا خود ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں تو آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کرا کر دیکھ لیں۔ اور وہ سجون اور معتقلات کا تذکرہ کرتے ہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ خدا کے آزاد بندے ان چیزوں سے نہیں ڈرا کرتے۔ حزب مخالف کے لیڈر ابراہیم شکری نے شروع میں کیمپ ڈیوڈ معاہدوں کی شرط تائید کی تھی لیکن اب وہ ان کے سخت مخالف ہیں اور اندرون ملک ان کے اثرات کافی بڑھ گئے۔ بہت سے سنجیدہ باوزن لوگ اور غیر مطمئن طبقہ سب ان کے ساتھ آ گیا ہے۔ عرب دنیا کے متعدد اجتماعات میں حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے شریک ہو کر باہر بھی متعارف ہو گئے ہیں اور عرب قیادات سے تعلقات بھی قائم کر لئے ہیں۔ ان سب باتوں سے سادات سخت برہم ہیں۔ پھر بین الاقوامی حالات بھی کچھ ناسازگار ہیں۔ ریگن نے کیمپ ڈیوڈ معاہدوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ ہیگ صاحب سادات کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں وہ سعودیہ کویت اور امارات کے چکر لگا رہے ہیں۔ بلکہ اب تو شام کو ان سے زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں۔ فرانس میں متراں کی کامیابی سے ان کی اہمیت کم اور اسرائیل کی بڑھ گئی ہے جبکہ ویستان ان کو زیادہ وزن دیتے تھے۔ عراق مصر سے اسلحہ اور گولہ بارود تو خرید رہا ہے لیکن پیسے دے کر۔ سادات اس کا بہت زیادہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں لیکن عراق پیسوں کے علاوہ کچھ دینے پر تیار نہیں۔ ان سب واقعات نے مل کر سادات کو پریشان کر رکھا ہے اور ان کے لہجے میں چڑچڑاپن

آ گیا ہے اور نزلہ اسلام پسند عناصر اور حزب مخالف پر گر رہا ہے۔ آجکل ہر طرف سے حزب مخالف پر حملے ہو رہے ہیں کہ ان کو سیاست کی تمیز نہیں۔ ڈیموکریسی میں زندہ رہنے کا سلیقہ نہیں۔ ڈیموکریسی کے حدود نہیں معلوم اور ڈیموکریسی سے غلط فائدہ اٹھا کر مادر وطن کو بدنام کر رہے ہیں۔ ان کے بیانات اور ان کے ہفت روزہ کی تنقیدیں مصر مخالف ممالک میں اور اخبارات میں شائع ہوتی ہیں اس سے قوم و وطن کی بدنامی ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ڈیموکریسی کا کوئی نیا نسخہ پیش ہونے والا ہے۔ ایک تجویز یہ آ رہی ہے کہ پارٹی کے اندر ہی ایک مخالف ونگ قائم کی جائے، لیکن لوگوں نے اس پر تنقید کرنے کے بجائے اس کا مذاق اڑایا، اور اب دو پارٹی سسٹم کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ بہرحال اب حزب مخالف نئی صورت پر جلوہ گر ہونے والا ہے۔ جس کو شاید صرف تائید و تعریف کی آزادی حاصل ہوگی۔ ابراہیم شکری اور ان کی پارٹی سے بھی سادات کو یہی توقع تھی اور انھیں نے خالد محی الدین کے اثر کو کم کرنے کے لئے ان کو آگے بڑھایا تھا لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ اس کا اعتراف خود سادات نے کیا۔ انھوں نے اپنی ایک عوامی تقریر میں جلے ہوئے لہجہ میں کہا کہ آج جو حزب مخالف کے زعیم بنے پھرتے ہیں انھیں میں نے آگے بڑھایا ہے اور ان کی پارٹی میں نے قائم کروائی، انتخابات میں کامیابی کے مواقع میں نے فراہم کئے اور وہی اب یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ مصر میں ڈیموکریسی نہیں۔ شکری نے جواب میں لکھا ہے کہ صدر نے صرف چودہ نشستوں کی منظوری دی تھی اور اس میں بھی اپنے ہم زلف محمود ابو وافیہ کو شامل کر دیا تھا کہ اس طرح ایک گروپ ابو وافیہ کے ساتھ رہے گا اور شکری پارٹی لیڈر رہتے ہوئے بھی زیادہ وزن نہیں رکھیں گے لیکن ان کی پارٹی کو ۳۰ نشستیں ملیں اور ابو وافیہ کو ان کی پارٹی سے نکلنا پڑا اور وہ سادات کی پارٹی میں شامل ہو گئے، بہرحال شروع میں تو شکری اور ان کے ترجمان کا لہجہ نرم رہا لیکن کچھ اچھے پڑھے لکھے، سیاسی ماضی اور وزن و وقار رکھنے والے ان کے ساتھ ہو گئے

تو ان کا لہجہ بدل گیا شروع شروع میں اسرائیل سے صلح کی تائید کی تھی لیکن اب اسکے سخت مخالف ہیں اور اسی وجہ سے مصر میں ہر طرف سے حملوں کا نشانہ۔

یہ لوگ جواب میں کچھ بول تو لیتے ہیں لیکن دوسرا طبقہ ایسا ہے جس کو "آہ" کرنے کی بھی آزادی نہیں ہے۔ یہ ہیں اسلام پسند طلبہ اور نوجوان۔ یونیورسٹیوں کی یونینوں پر ان کا غلبہ ہو گیا تھا اس کے جواب میں اب یونینوں کا نظام ہی ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اسلام پسند نوجوانوں پر نگرانی اور سختی میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کو اجتماعات یا کیمپ لگانے میں بڑی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور خطرناک بات جس کی طرف "الدعوۃ" نے بھی توجہ دلائی ہے کہ ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو جماعات اسلامیہ میں شامل کیا گیا ہے جو انتشار پھیلائیں، انتہا پسند نعرے لگائیں اور غلط افکار و نظریات کو رواج دیں۔ اسی طرح اسلامی مطبوعات پر بھی سختی ہو گئی ہے۔ عرب ممالک میں چھپی ہوئی کوئی بھی کتاب ازہر کی منظوری کے بغیر ملک میں داخل نہیں ہو سکتی اور مصر میں چھپی ہوئی کوئی کتاب ازہر کی منظوری کے بغیر باہر نہیں جا سکتی۔ اور ازہر کے شیوخ کی ایک بڑی تعداد برسر اقتدار پارٹی کی ممبر ہے پھر اس کے ذمہ داروں کو سخت ہدایات ہیں۔ اس سے اسلامی کتابوں کی اشاعت و ترویج میں رکاوٹ پڑ رہی ہے۔

اس کے ساتھ ایک کارروائی بڑی تیزی سے ہو رہی ہے جس کو ایک مقامی ماہنامہ نے "اسلمۃ مصر" یعنی مصر کے ISLAMI کا نام دیا ہے، یعنی اسلام کی سرکاری اشاعت کی جائے اور اس طرح کا اسلام جیسا کچھ ہوگا ظاہر ہے۔ "التصوف الاسلامی" نام کا ماہنامہ نکالنے کے لئے حکومت سے بڑی رقم امداد میں ملی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی آزاد مساجد کو وزارت اوقاف کے تحت لیا جا رہا ہے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر شیخ متولی شعراوی کو مسلط کر دیا گیا ہے اور ان کی تقریریں وغیرہ بڑے پیمانہ پر شائع ہو رہی ہیں۔ ان کا کمال ہے کہ بہترین اور فصیح زبان میں بولتے ہیں کہ آدمی مسحور ہو جائے لیکن پوری تقریر

یا پوری کتاب کے بعد یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہا کیا جا۔

بقیہ ص ۳ : اداریہ

غرض ایک طرف ہماری وحدت ملی پارہ پارہ ہے، دوسری طرف چند گمراہ حکمرانوں کی بدولت اسلامی وطن بدترین دشمن انسانیت طاقت کا ضمیمہ بنا ہوا ہے۔ صورت حال وہ ہے جسے دیکھ کر ایک صاحب بصیرت عرب عالم نے کہا تھا،

" انکم تستبطئون الرحمۃ وانا استبطئ الرجمۃ۔

تم سمجھتے ہو رحمت خداوندی کے آنے میں دیر ہو رہی ہے اور انتظار کرتے کرتے تم اکتا رہے ہو مگر میں (تمہارے حالات دیکھ کر) غضب خداوندی (سنگ باری) کے نازل ہونے میں تاخیر دیکھ رہا ہوں۔

سنہ ۱۴۰۱ھ کے رمضان نے ہمیں اس حال میں چھوڑا ہے، آگے اس کی مرضی و مشیت!!

(ع۔ ع۔ ن)

بقیہ ص ۱۱

ہیں وہ کسی ایسے شخص سے پوشیدہ نہیں جو کچھ دینی معلومات اسلامی حقائق سے معمولی بصیرت اور دین اسلام کی طبیعت اور مزاج سے کچھ بھی مناسبت رکھتا ہو، مولانا فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اس پر غور کیا جائے کہ مرزا صاحب کے دعوائے نبوت سے لوگوں کو کیا فائدہ پہونچا، پھر حضرت مسیح علیہ السلام یا امام مہدی علیہ السلام کے جو اوصاف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں وہ مرزا صاحب کے اندر موجود ہیں یا نہیں اور یہ کہ ان کی انفرادی اور نجی زندگی کیسی تھی اگر صرف اسی نہج سے اس تحریک کو پرکھا جائے اور مرزا صاحب کے دعووں کا جائزہ لیا جائے تو اس تحریک کا بطلان اور کذب و افترا ہونا معلوم ہو جائے گا۔ مرزا صاحب کی تحریک سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان پہونچا، ان کی صف میں افتراق و انتشار پیدا ہوا، ان کی وحدت و جمعیت متاثر ہوئی اور پورا ہندوستان ان کے دعووں اور تبلیغ کی وجہ سے عجیب کشمکش سے دوچار ہوا۔ اسی طرح حضرت مسیح کے نزول سے متعلق جو احادیث و آثار پائے جاتے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزول سے مسلمانوں کا دینی فائدہ ہوگا، ان کی دینی اور دنیاوی حالت سدھر جائے گی، ان کے آپس کی عداوت و نفرت مٹ جائے گی، ان کی معاشی بدحالی دور ہو جائے گی، پوری دنیا میں دین اسلام کو غلبہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ آپ فرماتے ہیں کہ ان میں سے کوئی علامت مرزا صاحب کے وجود سے ظاہر نہیں ہوئی بلکہ یہ سب باتیں برعکس ہیں۔ غور سے دیکھا جائے کہ مسلمانوں میں کس قدر بغض و عداوت ہے، کس قدر افلاس ہے، اور دنیا میں کس قدر تفرق ادیان ہے اور پھر یہ کہ اسلام کس قدر ضعیف ہو گیا ہے۔" (فیصلہ آسمانی)

اور ان کے امام مہدی ہونے کے دعوی کی تردید میں فرماتے ہیں کہ:-

"امام مہدی علیہ السلام کے نزول کی علامت یہ ہے کہ تمام کافر اسلام لے آئیں گے اور دنیا سے فسق و فجور اٹھ جائیگا۔"

اس سلسلہ میں معیار صداقت میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"ایک فتوی مرزا صاحب اور ان کے خلیفہ اور صاحبزادہ کا یہ ہے کہ جو کوئی مرزا صاحب پر ایمان نہیں لایا وہ کافر ہے اس کے پیچھے نماز ہرگز جائز نہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں تقریباً ۲۲ کروڑ مسلمان تھے وہ مرزا صاحب کے وجود سے سب کافر ہو گئے بجز قلیل گروہ کے، اور کوئی کافر مسلمان نہیں ہوا۔"

اسی موثر انداز میں آپ نے مرزا صاحب کے دعووں اور پیشین گوئیوں اور سارے الہامات کا تنقیدی جائزہ لیا اور انہیں دجل فریب اور سفید جھوٹ ثابت کیا ہے، کوئی بھی انصاف پسند انسان غیر جانبداری کے ساتھ ان کتابوں کا مطالعہ کرے تو ان سے متاثر اور مطمئن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

رد قادیانیت کے سلسلے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کا یہ ہلکا سا عکس ہے، اس کے تفصیلی جائزہ کے لئے تو پورا دفتر بھی ناکافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تنہا آپ نے وہ کارنامہ انجام دیا جو متعدد جماعتیں اور تحریکیں بھی اتنی کامیابی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتیں، آپ کا یہ کارنامہ اتنا عظیم کارنامہ ہے جسے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور جو امتداد زمانہ کے باوجود ہمیشہ زندہ و پائندہ اور درخشاں ستارے کے مانند تاریخ کے افق پر چمکتا اور دمکتا رہے گا۔

تعمیر حیات میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے۔
(منیجر)

بھالو کے پنجے

کیف بلرام پوری

پچھلی صدی میں جتنی تبدیلیاں روسی سرحدوں میں ہوئی ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ریپبلک کا وجود جیسا کہ عام تاثر دیا جاتا ہے نہ تو فطری ہے اور نہ منصفانہ بلکہ صریحاً کمزور قوموں پر قبضۂ غاصبانہ ہے۔ کریملن کی سیاست خاموش، سرد اور مکارانہ چالوں سے بھری ہوئی ہے۔ نام نہاد مزدوروں کی تحریک پر ہمیشہ سے وہاں چند شاطروں کا قبضہ رہا ہے۔ روس کے حقیقی باشندے ہی تقریباً ہر اہم مقام پر فائز رہے ہیں اور ہیں اور مختلف ثقافتی، سیاسی اور مذہبی گروہوں اور اقلیتوں کو اُن کا ہر جائز و ناجائز حکم ماننا پڑا ہے۔ زارشاہی اور کیمونسٹوں میں صرف تخت اور پولٹ بیورو کا فرق رہا ہے۔ ازبک ہوں یا تاتاری، تاجک ہوں یا قازقی یا ترکمان سب کو اس مقام پر جھکایا گیا ہے جہاں کیمونزم کے نام پر کوئی نہ کوئی بڑا بھالو منہ پھیلائے کھڑا رہا ہے۔ خدا کے وجود سے منکر پیغمبروں اور نبیوں کا مذاق اڑانے والا، ثقافتی کارناموں کا علمبردار روس، جہاں فطری اور شخصی آزادی کو بُری طرح کچلا گیا ہے اور کچلا جا رہا ہے اپنی سرحدوں کو بڑھانے کا ماہر ہے۔ زاروں سے لے کر آج تک روس پانی میں لہروں کی طرح پھیلتا رہا ہے۔ ترکوں کے علاقے ہتھیا کر اعلان ہوا کہ ترک سامراجی تھے روسی نجات دہندہ بن گئے مسلم اکثریت کے تمام علاقوں کو روس میں ضم کر لیا گیا اور مذہبی و ثقافتی لوٹ کھسوٹ شروع ہو گئی۔

روسی دفاعی پالیسی کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ جدھر سے اُسے ذرا سا بھی خطرہ محسوس ہوا اس علاقہ کو ہتھیا کر ایک نئی روسی ریپبلک کا قیام عمل میں لایا گیا اور وہاں پروپگنڈے کے زور پر دودھ کی نہریں بہائی جانے لگیں اور سائبیریا کے مزدور کیمپ اس علاقے کے آزادی پسند لوگوں کے خون سے سرخ ہونے لگے۔

کارل مارکس کا خواب ایک تھکے ہوئے مفکر کا خواب تھا، ایک ٹھکرائے ہوئے یہودی کا انتقامی جذبہ جس پر روسی کیمونزم کا بھونڈا محل کھڑا کیا گیا ہے اور جو ہمیشہ سے پولٹ بیورو کے چند شاطروں (کبھی کبھی صرف ایک شاطر) کی چالوں کا اکھاڑا رہا ہے۔ ہٹلر شکست کھاتا ہے تو بدترین ڈکٹیٹر کہلاتا ہے۔ اسٹالن فتحیاب ہوتا ہے اور کمزور قوموں کا بخیہ ادھیڑتا ہے، دیوار برلن پر لاشیں جھولتی نظر آتی ہیں، جرمنی تقسیم کر دیا جاتا ہے (مشرقی جرمنی میں آج بھی تقریباً تین لاکھ روسی فوجی مہمان نوازی کا لطف اٹھا رہے ہیں) ہٹلر کا استبداد ٹوٹتا ہے تو روسی جبر مسکراتا ہے پروپگنڈے کی ایک مشین فیل ہوتی ہے تو دوسری چلنے لگتی ہے اس بار روسی بارود کے ساتھ ثقافتی ٹینک اور کلچرل بکتر بند گاڑیاں حرکت میں آجاتی ہیں، سوویت روس کی بہشت کے جلوے دکھائے جاتے ہیں۔ مغربی طاقتیں جو لوٹ کھسوٹ میں کافی بدنام ہو چکی تھیں اس روسی عفریت کے لئے زمینوں اور ملکوں کو خالی کر دیتی ہیں اور اعلان عام ہوتا ہے کہ دنیا کے غریبوں کا نجات دہندہ روس آگیا، سرخ سویرا، سرخ پرچم، قتل و غارت گری، آتشزنی، انقلابی نعرے اور پھر ہر طرف پولٹ بیورو کا شکنجہ۔

روسی ہٹلر برزنیف افغانستان میں دندناتا پھر رہا ہے اور جھوٹ پر جھوٹ روسی ذرائع ابلاغ بول رہے ہیں، لچر سے لچر جواز روسی حملہ پر پیش کیا جا رہا ہے اور افغان خون پہاڑیوں پر پھیل رہا ہے یہ حملہ بھی اتنا ہی شرمناک ہے جتنا ویتنام پر امریکی حملہ تھا، جس بے غیرتی کے ساتھ روسی فوجیں افغانستان میں اتاری گئی ہیں اور افغانستان میں کٹھ پتلی سرکاریں وجود میں آئی ہیں اسی کی کہانیاں بدترین سامراجیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ اب نہ جانے حق گو زبانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اب ساری انسانیت کا ٹھیکہ لینے والے لب کیوں خاموش ہیں اب حریت پسندوں کو "پراودا" ڈاکو کہہ رہا ہے۔ ریڈیو ماسکو انھیں لیٹروں کے لقب سے یاد کر رہا ہے، یہ کھلا ہوا ہٹلرازم ہے۔ یہ کہنا کہ وہاں امریکہ یہ کرنے والا تھا وہ کرنے والا تھا، یہ سازش ہو رہی تھی وہ سازش ہونے والی تھی حفیظ اللہ امین امریکی ایجنٹ تھا، غدار تھا ببرک کرمال وفادار ہے انقلاب دوست ہے، صرف روسی بدکرداری پر پردہ ڈالنے والی باتیں ہیں، روس آخر کون ہوتا ہے کہ افغانستان میں مداخلت کرے۔ دس لاکھ افغان عوام کیا پاگل ہیں جو اپنا عزیز وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ کسی ملک میں کیا ہوتا ہے وہاں کون سے عناصر حکومت بناتے ہیں وہ کس عقیدہ کے ماننے والے ہیں یہ کام روسیوں کا نہیں کہ وہ چودھری بن کر فیصلہ کریں ہر ملک کا حق ہے کہ اس کے اندرونی معاملات میں ہرگز مداخلت نہ کی جائے۔ روسی تو بہت ہی ادنیٰ درجہ کے سامراجی ثابت ہو رہے ہیں۔ مجھے ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ زمانہ یاد آ رہا ہے جب کسی ایک نواب کو گدی سے ہٹا کر اس کے بھائی یا لڑکے کو تخت سونپا جاتا تھا کبھی کوئی راجہ مارا گیا تو کبھی نواب۔ سراج الدولہ، ٹیپو جان سے گئے جعفر اور صادق جو اپنے اپنے دور کے تراقی اور ببرک تھے ننگِ ملت، ننگِ دیں اور ننگ وطن کہلائے۔ یہ افغانستان میں کس عقیدہ کی تبلیغ ہو رہی ہے؟ برزنیف تو خود ہی لینن کے راستہ سے بھٹک گیا ہے۔ برزنیف تو اپنے آپ کو افغانستان کا آیت اللہ خمینی سمجھ بیٹھا ہے۔ اسے بڑی لگن ہے افغانی انقلاب کو کامیاب کرنے کی وہ افغان باشندوں کو آزاد کرنے نکلا ہے خدا کی شان ہے وہ ملک دوسرے ملک کو آزاد کرنے چلا ہے جہاں بڑے بڑے مفکر و دانشمند دار و رسن کی آزمائش سے گزر رہے ہیں۔

روس دوستی کا معاہدہ افغان عوام کو بے حد مہنگا پڑا ہے اچھا طریقہ ہے دوستی کرو ایک ملک کو دوسرے ملک کے حملے سے بچانے کے لئے اور پھر اس ملک میں کلچرل انقلاب لانے کے لئے اپنی فوجیں اتار دو سامراجیت اور کس کو کہتے ہیں؟ کیمونزم کا لیبل لگانے سے کیا سامراجیت چھپ جاتی ہے؟ جس طرح افغان عوام پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں گاؤں کے گاؤں بم سے تباہ ہو رہے ہیں۔ ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں سے آگ اگلی جا رہی ہے اُس پر تو ببرک کرمال کا دل بھی اگر باقی ہوگا تو بھر آتا ہوگا مگر اب جعفر سامراجیوں کی قید میں ہے پولٹ بیورو کے شکنجہ میں جی حضوری کے علاوہ کیا کر سکتا ہے؟

ایک مصلحت آمیز اور اصول شکن منطق یہ سننے میں برابر آ رہی ہے کہ روس کو برا بھلا نہ کہو، بلکہ کچھ نہ کہو اس طرح وہ خود بخود افغانستان سے چلا جائے گا۔ روس تو دراصل امریکہ کی وجہ سے افغانستان میں آیا ہے باقی سب خیریت ہے۔

حملہ آور کو حملہ آور کیوں نہ کہا جائے

کیا یہ بارہویں صدی ہے؟ کیا یہ چنگیز و ہلاکو کا زمانہ ہے؟ کیا یہ دور بخت النصر کا ہے؟ کیا افغان عوام تبتیوں سے بھی گئے گزرے ہیں؟ ہم دلائی لامہ کو پناہ دے سکتے ہیں، ہم بنگلہ دیشیوں کے کندھوں سے کندھا ملا کر لڑ سکتے ہیں انھیں آزادی دلا سکتے ہیں مگر ہم روس سے صاف صاف یہ نہیں کہہ سکتے کہ "یہ غلط بات ہے آپ فوراً افغانستان خالی کریں ورنہ ہمیں بھی اب آپ کی دوستی درکار نہیں"۔ کل جب خون میں لت پت افغان عوام روسیوں کو ملک سے نکالیں گے یہ دن آئے گا آپ یقین مانیں یہ گھڑی ضرور آئے گی پھر ہم افغان عوام کو کیا منہ دکھائیں گے؟ افغانستان وہ ملک ہے جس نے برصغیر میں مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور واحد اسلامی ملک تھا جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کو تسلیم کرنے کے خلاف ووٹ دیا وہی افغانستان روسی بھالو کے پنجے میں سسک رہا ہے اور ہم نہ صرف بھالو کی منہ بھرائی کر رہے ہیں بلکہ تاریخ کے اس الزام کے لئے خود کو تیار کر رہے ہیں کہ "ہم ایسے غیر جانبدار تھے جیسے اکثر ڈپلومیٹ ہوتے ہیں"۔

روس چاہتا ہے کہ ہماری دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھائے سو اٹھا رہا ہے۔ روس سے دوستی کا معاہدہ اب بے حد مہنگا پڑ رہا ہے، مشرقی یورپ کی آزادیاں پہلے ہی چھینی جا چکی ہیں اب نئے نئے میدان دوستی کے پردہ میں تلاش کئے جا رہے ہیں جہاں خلاء پیدا ہو وہاں روسی دوستی مسکراتی نظر آئے گی، دراصل روسی اس منزل پر پہونچ چکے ہیں جہاں سے انگریز پیچھے ہٹے تھے اب روس سامراجیوں کا رول ادا کرنے پر تل گیا ہے، امریکہ اور مغربی طاقتیں چین کے ساتھ مل کر اپنی بقاء کے لئے کوشاں ہیں جاپان اور جنوب مشرقی ممالک بھی روس سے خوفزدہ ہیں لہٰذا ان کا اتحاد یقینی ہے۔ افغانستان کا بحران ایک نہ ایک دن رنگ ضرور لائے گا یا تو روسی ذلیل ہو کر پیچھے ہٹیں گے جس کا قوی امکان ہے لیکن بصورت دیگر لڑائی ہماری سرحدوں تک آجائے گی، کیونکہ بھالو ایک اور جست لگانے پر مجبور ہوگا اور لامحدود جنگ چھڑ جائے گی۔ روس نے افغانستان پر حملہ کرنے سے پہلے ہم سے کوئی مشورہ نہیں کیا جو دوستی کے معاہدہ کے تحت لازمی بات تھی لہٰذا ہمیں اعلان کرنا چاہئے کہ "روسیو! افغانستان چھوڑ دو"۔

ادیب و شاعر دو اقسام کے اس دھرتی پر پائے جاتے ہیں "دقیانوسی" (یہ لقب انھیں دوسروں نے دیا ہے) اور "ترقی پسند" (یہ لقب انھوں نے خود اختیار کیا ہے) دونوں قسم کے دانشور افغانستان کے بحران پر خاموش ہیں اسے ویت نام میں انسان بستے تھے تو کیا افغانستان میں انسان نہیں بستے وہاں بھی لاشوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں وہاں بھی آدمیت سسک رہی ہے ایک چھوٹی سی قوم ایک دیوقامت سامراج سے ٹکرا رہی ہے کچھ تو کہو! احتجاج کے طور پر اپنے قلم ہی توڑ کر سڑکوں پر پھینک دو، برائی کہیں بھی ہو، کسی سے بھی سرزد ہو رہی ہو برائی ہے۔ سیاست داں عقل کے تاریک ترین گوشہ سے سوچتے ہیں آپ تو دانشور ہیں نہ امریکی ہیں اور نہ روسی اس عظیم ملک کے رہنے والے ہیں جسے دنیا ہندوستان کے نام سے جانتی ہے۔

روس دن بدن آدم خور شیر کی طرح دیدہ دلیر ہوتا جا رہا ہے آغاز سے پہلے کے ان لمحات میں اگر سختی کے ساتھ اس کی مخالفت نہ کی گئی تو پوری دنیا کو اس نئے ہٹلرازم سے دوچار ہونا پڑے گا ظاہر ہے کہ انجام ایک بھیانک جنگ کے علاوہ کچھ بھی نہ ہوگا امریکی بحری بیڑے حرکت میں ہیں روس بھی سمندروں کے سینوں پر منہ اٹھائے چل رہا ہے۔ برطانوی نیوی خاموشی سے سرگرم عمل ہے چین ہڈی پر نظر گڑائے بھونک رہا ہے، جاپان روس سے اپنا جزیرہ واپس نہ ملنے پر ناراض ہے اور اپنی فوجوں کی برق رفتاری کے بارے میں فکرمند ہے۔ فرانس بہرحال امریکی اتحادی ہے، مغربی جرمنی خائف کر تیاری میں مشغول ہے کسی وقت بھی افغانستان کو لے کر کچھ ہو سکتا ہے۔ ان لمحات میں ایک منٹ بھی روس کا افغانستان میں ٹھہرنا نہ صرف افغانستان کے لئے بلکہ ہماری بقاء کے لئے بھی بے حد خطرناک ہے غیر جانبداری کی تحریک کو روس کی اس حرکت سے جو صدمہ پہونچا ہے وہ دنیا بھر پر عیاں ہے، دنیا روس کی اس حرکت پر ہمیں "خاموش مجرم" سمجھ رہی ہے۔ افغانستان کے آئینہ میں بہت کچھ دنیا پر روشن ہو چکا ہے۔ اور افغان قوم روسی شکنجہ میں پڑی سسک رہی ہے ایک لیڈر صاحب جو موقع پرستی، دل بدل اور پینترے بازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے فرماتے ہیں کہ "افغانستان میں روس اسی طرح مدد کرنے آیا ہے بلکہ بلایا گیا جس طرح ہم بنگلہ دیش کے بحران کے وقت مدد کے لئے کوشاں تھے"۔ جناب افغانستان میں کون سے بہاری اور بنگالی بستے ہیں؟ ہاں ببرک کرمال کو آپ یحییٰ خاں کا لقب اگر دینا چاہیں تو کچھ بات سمجھ میں آتی ہے دوسرے ملکوں میں خانہ جنگی کرانے کے لئے اگر روسی دوستی کے پردہ میں اسی طرح دوستی قبول کرتے رہے تو پھر حسب ضرورت کسی بھی ملک میں کسی بھی ببرک کرمال جیسے میر جعفر کے بلانے پر وہاں کی حفاظت سے پہنچ سکتے ہیں بات یہ ہے جناب اگر یہ بات بالکل غلط ہے روسیوں کو بڑی سختی کے ساتھ افغانستان چھوڑنے کے لئے کہنا چاہئے۔ ورنہ نہرو، ناصر اور ٹیٹو کی غیر جانبداری کی تحریک جو ادھ مری ہو چکی ہے یکدم دم توڑ دے گی، حقیقت یہ ہے کہ بہت سے ملک کا رویہ افغانوں کے ساتھ انتہائی توہین آمیز بزدلانہ اور موقع پرستی پر مبنی ہے، اور شاید افغانستان کے حریت پسند اسے شدت سے محسوس بھی کر رہے ہوں۔

ماسکو اولمپک عرصہ ہوا ختم ہو چکے ہیں اب روسی پوری شدت سے افغان گوریلوں پر وہ تمام ہتھیار آزمائیں گے جن کی ہولناکی کا انھیں ابھی تجربہ کرنا ہے خیر! آزاد رہنے کے لئے دنیا کی ہر بہادر قوم انھیں منازل سے گزرتی ہے افغانستان کے جیالے عوام برطانیہ جیسی طاقت سے ماضی میں ٹکرا کر اپنی آزادی برقرار رکھنے میں باعزت طور پر کامیاب رہے ہیں۔ مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ، آسٹریا، پولینڈ اور ہنگری روسی تلوار کے سایہ میں بھلے زندگی کے دن کاٹنے پر مجبور ہوں، افغانستان روس کو بہت مہنگا پڑے گا افغانستان میں روس نے جو ڈرامہ شروع کیا ہے اس کا کلائمکس سمرقند و بخارا میں دیکھا جائے گا۔ انشاء اللہ

سنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی خان بادشاہ تھے یا ہوا کرتے تھے جنھیں افغان عوام سے بڑی محبت تھی اب نہ جانے وہ بیچارے کہاں چلے گئے خدا کرے کہ وہ بھی کسی روسی اسپتال میں زیر علاج نہ ہوں جہاں بہت سے افغانوں کا ذہنی توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کاش! افغان حریت پسندوں کو ان کی رہنمائی نصیب ہوتی۔

کوئی کچھ کہے بہر کیف برزنیف لینن کا چہرہ مسخ کر رہا ہے دنیا کے ہر شریف انسان کو روس کی نہ صرف مخالفت بلکہ مذمت کرنی چاہئے ورنہ بہت جلد ہی کوئی نیا ملک روس کا اگلا شکار ہوگا۔ ہٹلر اور مسولینی کا فسانہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا۔ اب امین، تراقی اور ببرک کرمال تک ہی بات محدود نہ رہے گی۔ ابھی نہ جانے کتنے افغان سربراہ مارے جائیں گے۔ جس کی وفاداری میں ذرہ برابر بھی شک ہوگا وہ پہلے روسی کلچرل آئیڈیالوجی کے مطابق انقلاب دشمن قرار دیا جائے گا، اور پھر کے۔ جی۔ بی۔ (K. G. B.) کے ایجنٹ اسے موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔

کسی بھی بڑی طاقت کے تقریباً دس ڈویژن فوجی ہزاروں ٹینک اور ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر وغیرہ وغیرہ اگر کسی چھوٹے سے ترقی پذیر ملک میں در آئے ہوں تو اس ملک کی نام نہاد حکومت ظاہر ہے کہ کٹھ پتلی ہوگی۔ اسے کوئی احمق یا پھر روس کا حواری ہی تسلیم کر سکتا ہے۔ روسی جبروت پر جس قدر پردہ ڈالا جائے گا حالات کی مضحکہ خیزی یا یوں کہیے کہ پالیسی کا لچرپن اور زیادہ واضح ہوتا جائے گا۔ اب جس قدر جلد ممکن ہو سکے روسی حملہ کی بھرپور نہ صرف مذمت کیجائے بلکہ ہمارا نعرہ ہو "روسی جنگ بازو افغانستان سے فوراً ہٹ جاؤ تمہیں اس خطہ اور دنیا کا امن تباہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔

نگران اعلیٰ:
مولانا ابو العرفان ندوی
مجلس ادارت:
نذر الحفیظ ندوی، شمس الحق ندوی
محمود الازہار ندوی
پرنٹر، پبلشر جمیل احمد نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دھلی میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ کے لئے شائع کیا۔

دعائے مغفرت

حاجی رعایت اللہ صاحب بشیری ہوٹل، پریل، بمبئی کا ۶ر رمضان کو انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حاجی صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بہی خواہوں میں تھے اور یہ تعلق تادم آخر قائم رہا۔ حاجی صاحب خیر کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ادھر وہ کئی ماہ سے علیل تھے۔ ان کے پسماندگان میں ان کے چھوٹے صاحبزادے مولوی محمد عمر ندوی، ندوہ سے فارغ ہیں۔ قارئین تعمیر حیات سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔